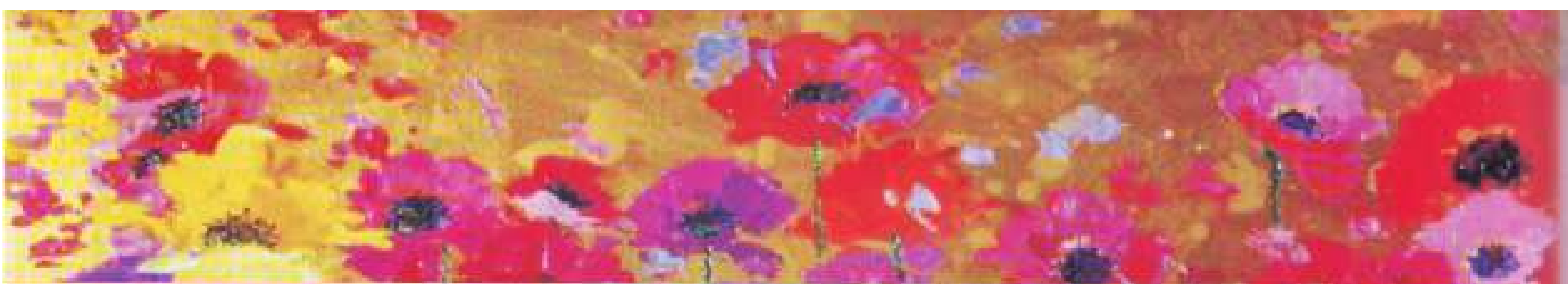

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا ۱۴واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ ارژنگ لاہور

مارچ ۲۰۱۲ء
جلد: 14 شمارہ: 3

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

معروف کالم نگار یاسر پیرزادہ کے کالموں کے دوسرے مجموعے "ذراہٹ کے......۲" کی تقریب پذیرائی کے مناظر

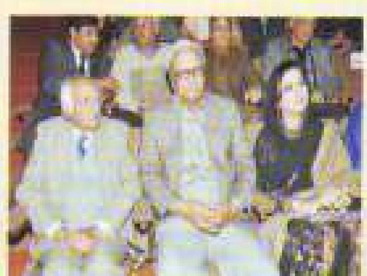

[illegible]

MONTHLY ARXANG LAHORE

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 14 ۔۔۔ مارچ 2012ء ۔۔۔ شمارہ نمبر 3

مدیر
حسن عباسی

مدیران اعزازی
ڈاکٹر صغرا صدف، ابرار ندیم

ڈپٹی ایڈیٹرز (اعزازی): زبیر بشیر، صفدر علی صفدر (کویت)
اسسٹنٹ ایڈیٹر: کامران ندیم

حمد		۲
نعت		۳
انٹرویو	خالد مسعود خاں	۴
صوفی	عطاء الحق قاسمی	۶
عیدی	حافظ مظفر محسن	۷
شعروادب	احسان دانش	۸
حسن کا حسنِ تحریر	نعیم احمد بشیر	۱۰
حی علی الفلاح	ابرار ندیم	۱۲
سورج چڑیاں اور رب	اجیت کور (بھارت)	۱۳
کالے کنویں	اجیت کور (بھارت)	۱۵
گبریلا مسترال اور پابلو نرودا کی شاعری	عامر بن علی	۱۶
اور میں نے راز فاش کر دیا	حافظ مظفر محسن	۲۲
دوغلی	شمینہ سید	۲۳
پاپا گھوڑے بنتے ہیں	سید اقبال حیدر (کینیڈا)	۲۵
شاعری		۲۷ تا ۳۷

ناصر زیدی، اقبال اختر، اشفاق حسین، شکیل سروش، منصور آفاق، واجد امیر، ایوب ندیم، عطا محمد خان، سید امتیاز احمد، عمرانہ مشتاق، اسد رضوی، مظفر حسن مبارک، جنید آذر، عرفان صادق، ارشد ملک، اعجاز فانی، راحیلہ رباب، ایوب صابر، حسن بانو، افضل عباسی، سلیمان جاذب

تبصرہ کتب		۳۸
مکاتیب شمس الرحمن فاروقی بنام راشد		۳۹
مختصر خبریں		۵۵

برائے خط و کتابت

نستعلیق پبلی کیشنز

الفیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0092+423+7351963 / 0300-4489310

E.Mail: arzangpk@yahoo.com

FAR EAST MARKETING CO.

SAMARIA MANSION 605 KOENJI-MINAMI 1-6-5,
SUGINAMI-KU, TOKYO, 166-0003,JAPAN
E-MAIL: femc1@hotmail.com

عامر حسین پبلشرز نے زاہد بشیر پریس ریتی گن روڈ سے چھپوا کر اردو بازار لاہور سے شائع کیا۔

حمد

میں ہوں کم تر، تو ہے برتر، تیری شان نرالی
میں قطرہ تو ایک سمندر، تیری شان نرالی
ارض و سما کے بھوٹتے لمحے تیری قدرت میں ہیں
تو ہے سب کا مرکز و محور تیری شان نرالی
در در کی جو ٹھوکر کھا کر تیرے در پہ آئے
اُس پر کھل جاتے ہیں سو در، تیری شان نرالی
بادل، بارش، مٹی، پانی، آگ ہوا اور موسم
صاف کشادہ ہر اک منظر تیری شان نرالی
تتلی بھنورے، شہد بناتی مکھیاں دیکھ کے دل میں
جذبے پھوٹیں سندر سندر، تیری شان نرالی
تو چاہے تو پیڑ برہنہ ہو جاتے ہیں پل میں
پل میں اُجڑے پیڑ ثمرور، تیری شان نرالی
ہر فریاد ریاضؔ ہمیشہ تیرے گوش گزارے
رہے نہ دل میں دُنیا کا ڈر، تیری شان نرالی

(سیّد ریاض حسین زیدی/ساہیوال)

زبانوں سے کبھی لفظوں کے موسم چھین لیتا ہے
کبھی ہر بے صدا منظر کو وہ گویائی دیتا ہے
بچھاتا ہے کبھی ہریالیوں کا فرش صحرا میں
گلستاں میں کبھی سفاک موسم بھیج دیتا ہے
برہنہ پائی دیتا ہے کبھی پتھریلے رستوں میں
کبھی وہ ٹھوکریں کھاتے ہوؤں کو تھام لیتا ہے
اُجالے جاری کرتا ہے کبھی تاریک ذہنوں سے
کبھی سورج کے آنگن میں اندھیرے بھیج دیتا ہے
کبھی آواز دیتا ہے شکستہ دل کے اندر سے
کبھی وہ بے نیازی کی ردائیں تان لیتا ہے
ڈبو دیتا ہے ساحل پر کبھی محفوظ کشتی کو
کبھی طوفان میں اُس کا کرم خود ناؤ کھیتا ہے
اُسی کے حکم سے جاری ہے گردش کہکشاؤں کی
اُسی کے حکم سے اظہر زمانہ سانس لیتا ہے

(اظہر ادیب)

دلوں میں یاد اُس کی ذکر ہے اُس کا بیانوں میں
اُسی کا نام نامی گونجتا ہے سب جہانوں میں
بہت حیران ہم ہوتے ہیں اُس کی بے نشانی پر
ہے تخلیقِ مکان و لامکاں اُس کے نشانوں میں
اُسی کی چاہتوں کا زندگی اظہار کرتی ہے
اُسی کا نام لے دُنیا زمانے کی زبانوں میں
گلوں میں حسن اُس کا، اُس کی خوشبو، اُس کی رعنائی
اُسی کی حمد کے نغمے عنادل کے ترانوں میں
نہ جب تک عشق ہو اُس سے نہ جب تک ذکر ہو اُس کا
نہیں ملتا کچھ اطمینانِ قلبی دو جہانوں میں
اُسی کے سب مناظر ہیں اُسی کے سب مظاہر ہیں
ستارے چاند سورج ہیں سبھی اُس کے نشانوں میں
زمیں کا ذرّہ ذرّہ صرف اُسی سے جگمگاتا ہے
اُسی کی ضو سے روشن ہیں ستارے آسمانوں میں
اُسی کا پیار ہے مظلوم بے چاروں کے ہونٹوں پر
اُسی کے تیر ہیں رکھے ہوئے ساری کمانوں میں
ندیمؔ اُس کے کرم نے کر دیا مسرور اس حد تک
وہی ہے خالی دامن میں ہی جل تھل خزانوں میں

(ریاض ندیم نیازی)

میں ایک گنبدِ بے در ہوں تو رہا کر دے
جو میرے سر پہ ہے وہ آسماں کھلا کر دے
جو میرے دل میں ہے پوشیدہ لفظ بن جائے
مری دعا کو مرے لب سے آشنا کر دے
دکھائیں دیں امکان کی حدیں ساری
مری نظر کو ستاروں کا آئینہ کر دے
جو میرے پاس نہیں ہے وہ مجھ کو مل جائے
جو میرے پاس ہے اوروں کو بھی عطا کر دے

(حماد ضیاء)

اے خدا!
اہلِ ایمان پر
کیسی آفت پڑی
خونِ مسلم ہے آج
ہر سو بکھرا ہوا
دشمنوں کے ہیں تیور بھی
بدلے ہوئے
اے خدا!
اہلِ ایمان کو
پھر دے سوزِ دروں
سر کٹانے کا جذبہ، محبت کا جذبہ
شہادت کا جذبہ، جو بڑھ کر یہاں
کفر کی ان دندناتی ہوئی
طاقتوں کو
مٹا دے، خدا
اے خدا!

(فاروق شہزاد)

ذکر کرتی ہوں صبح و شام ترا
میرے لب پر ہے صرف نام ترا
تو ہی مالک ہے سارے عالم کا
جس کو دیکھو وہ ہے غلام ترا
اونگھ تجھ کو کبھی نہیں آتی
کہہ رہا ہے یہی کلام ترا
کوئی مومن ہو یا کہ ہو کافر
سب پہ ہوتا ہے فیضِ عام ترا
ہم اُسے دل نہیں سمجھتے ہیں
جس میں ہوتا نہیں قیام ترا
ہے تری ذات ارفع و اعلیٰ
کوئی بتلائے کیا مقام ترا

(عینی راز)

درخشاں محسنِ انسانیتؐ کا راستہ ہے
بجز اس کے بہت تاریک ہر اک ضابطہ ہے
رسولِ ہاشمی ہیں مشرق و مغرب کے ہادی
پڑھو صلی علیٰ معبودِ حق کا فیصلہ ہے
جہاں میں حرمت و تکریم والا گھر ہے بطحا
ولادت کا اسی میں ضوفشاں اِک معجزہ ہے
مسلمانوں کی اُمیدوں کا مرکز شہر آقاؐ
اسی گلزار کا ہر اِک زباں پر تذکرہ ہے
گل سر سبد ہیں اس سلسلے کے فخرِ عالمؐ
اللہ العالمیں کا جو مقدس سلسلہ ہے
عطا کی ہے اماں بے کس کو جس نے اس جہاں میں
انہیں کے ہاتھ ہی میں آخرت کا مرحلہ ہے
اُسے معلوم ہے گوہرؔ یہ فن کتنا کٹھن ہے
جسے بھی نعت گوئی کا ذرا سا تجربہ ہے
(گوہر ملسیانی)

بیاں شانِ رسالت کر رہا ہوں
حقیقت میں عبادت کر رہا ہوں
نہیں مقدور گو نعتِ نبیؐ کا
مگر میں پھر بھی جرأت کر رہا ہوں
تصور میں مرے سیرت ہے اُنؐ کی
میں قرآں کی تلاوت کر رہا ہوں
ملا ہے درس اس کا آپؐ ہی سے
زمانے سے محبت کر رہا ہوں
خیالوں میں ہے روشن سبز گنبد
میں گھر بیٹھے زیارت کر رہا ہوں
کئی برسوں سے حاصل میں سعادت
برنگ نعت و مدحت کر رہا ہوں
(علی رضا)

تشنہ ہے مدحتِ حضورؐ ابھی......!

جب بھی لکھتا ہوں کوئی نعت جلیل
جب بھی چنتا ہوں مدحتوں کے گلاب
مجھ کو یہ زعم ہونے لگتا ہے
جیسے یہ نعت شاہکار بنی
کملیؐ والے کا اعتبار بنی
پھر یہ خود سے سوال کرتا ہوں
حق مدحت بھی ہو سکا ہے ادا......؟
تو صدائیں یہ دل سے آتی ہیں
مجھ پہ ہنستی ہیں مسکراتی ہیں
اور باور مجھے کراتی ہیں
فن یہ تم سے ہے کوسوں دور ابھی
تشنہ ہے مدحتِ حضورؐ ابھی
پہلے وہ لفظ تو تلاش کرو
جو زبانوں سے دور ہوں اب تک
جو بیانوں سے دور ہوں اب تک
جن کے سب حرف ہیں معطر سے
ہر گھڑی باوضو رہتے ہوں
ڈھونڈ پھر ایسا معتبر لہجہ
خوش جو میرے حضورؐ کو آئے
اور پھر باریاب ہو جائے
تب اگر کوئی نعت ہو جائے
تب اگر کوئی نعت ہو جائے
کملیؐ والے سے بات ہو جائے
پھر یہ دعویٰ ضرور کر لینا
ایسے اعزازِ فاخرہ سے ابھی
تم ہو احمد جلیل دور بہت!
(احمد جلیل/اوکاڑہ)

مری دُعاؤں میں آقا اثر عطا کر دے
صدف ہوں میں، مجھے میرا گہر عطا کر دے
خمارِ طوق و سلاسل، کہیں ہے رقصِ جنوں
جو دیکھ پائے، مجھے وہ نظر عطا کر دے
بڑے دُکھوں میں گزاری ہے زندگی کی شام
خوشی ہو جس کا ثمر، وہ سحر عطا کر دے
گری پڑی ہوں میں ناکامیوں کی دلدل میں
سو بے کسی کو مری، بال و پر عطا کر دے
میں لے کے کیا کروں عرشِ بریں کی جنت کو
کہ مجھ کو ایک تو اپنا ہی در عطا کر دے
ہے جسم و جان پہ ان دیکھا خوف سا طاری
سکوں کی جس میں ہو دولت، وہ گھر عطا کر دے
ترے ہی نام کا کرتی ہے ورد میری زباں
مدینے آؤں میں، اذنِ سفر عطا کر دے
بھٹکتے پھرتے ہیں ہم لوگ دشتِ خواہش میں
جو تیری سمت چلے، راہبر عطا کر دے
فلک پہ انجم و مہتاب ضوفشاں ہیں ابھی
مری شبوں کو بھی مولا قمر عطا کر دے
رہوں میں حرفِ اماں کے حصار میں آقاؐ
صدف ہوں، مجھ کو ثنا کا گہر عطا کر دے
(صغرا صدف)

سیرت رسولؐ پاک کی راہِ نجات ہے
حُبِّ رسولؐ ہی تو متاعِ حیات ہے
کوئی بھی حد نہیں کہیں اُن کے عُروج کی
مسند نشین عالمِ امکان ذات ہے
کندہ ہے میرے قلب میں صورت مدینے کی
اِس کے بغیر گزرے جو دن ہے نہ رات ہے
خُوشبو رچی ہوئی ہے مدینے کی خاک میں
مہکی ہوئی فضائیں ہیں پُرنُور رات ہے
ہر دم حضورؐ آپؐ کی میں یاد میں رہوں
ذکرِ رسولؐ پاک سے جیون ثبات ہے
اُنؐ کی ردا نے ڈھانپ لیا ہے مجید کو
ورنہ جہاں نے چھوڑی نہیں کوئی بات ہے
(عبدالمجید چٹھہ)

سنجیدہ شاعری کا گناہ میں نے نہیں کیا

تحریر کی پسندیدگی مستقل چیز نہیں ہے۔ کسی کتاب سے کمٹ منٹ بھی مستقل نہیں ہوتی۔

نیا شعر زیادہ مزہ دیتا ہے اور نیا شاعر ہانٹ کرتا ہے۔ ادب میں خاص پسند ناپسند چلتی رہتی ہے۔

جب حکومت مانتی ہی نہیں کہ حالات خراب ہیں تو پھر وہ اسے ٹھیک کیسے کرے گی۔ خالد مسعود خاں

معروف شاعر خالد مسعود خاں سے عامر بن علی کا خصوصی انٹرویو

خالد مسعود خاں کا شمار پاکستان کے مقبول ترین کالم نگاروں اور شاعروں میں ہوتا ہے۔ اپنے مخصوص انداز کی وجہ سے وہ مشاعروں کی جان اور اپنے منفرد طرزِ تحریر کے سبب قارئین کے بہت وسیع حلقے میں پسند کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے مزاحیہ شاعری کو مختلف زبانوں کی آمیزش سے نیا رنگ عطا کیا ہے۔ جسے عوام میں بہت پسند کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت وہ عالمی سطح پر اُردو کے نہایت مقبول اور معروف شاعر ہیں۔ اُن کے کالم نے بھی نہایت قلیل عرصہ میں صفِ اول کے کالم نگاروں میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ چند دن پیشتر عامر بن علی کی ان سے ہونے والی گفتگو ارژنگ کے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش ہے۔

ارژنگ: یہ خیال کب اور کیسے آیا کہ لکھنا چاہیے؟

خالد مسعود خاں: گھر میں پڑھنے لکھنے کا ماحول تھا۔ میرے دادا شاعر تھے اور والد شاعر ہونے کے علاوہ کالج میں لائبریرین تھے۔ بہت ہی پڑھے لکھے آدمی تھے۔ میرا کتاب سے تعلق بہت مضبوط اور پرانا ہے۔ کتاب سے تعلق کی بنا پر ہی میں نے زمانہ طالب علمی میں تقاریری مقابلوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ جن دنوں میں کالج میں زیرِ تعلیم تھا اور تقاریری مقابلوں میں حصہ لیتا تھا انہی دنوں مزاحیہ شاعری شروع کی تھی۔ بلکہ یوں کہیے کہ شروع ہوگئی تھی۔

ارژنگ: ویسے تو مزاح کو ہائی سیریسنس کہتے ہیں لیکن معروف معنوں میں کیا صرف مزاحیہ شاعری ہی کرتے ہیں یا پھر سنجیدہ شاعری بھی فرماتے ہیں؟

خالد مسعود خاں: سنجیدہ شاعری کا گناہ میں نے کبھی نہیں کیا۔ میری بیگم بھی مجھ سے کبھی کبھی پوچھتی ہیں کہ آپ سنجیدہ شاعری کیوں نہیں کرتے؟ میرا موقف یہ ہے کہ اُٹھتے ہیں اخبار کھولتے ہیں تو اس میں بڑی بڑی خبریں پریشان کن حالات کا بیان ہوتا ہے۔ کام پر جاتے ہیں تو وہاں بھی ٹینشن کا راج۔ باہر نکلتے ہیں تو وہاں بھی اچھی خبر مفقود اور اردگرد نظر دوڑائیں تو دکھی کرنے والے حالات نظر آتے ہیں۔ ایسے عالم میں مزاحیہ شاعری کے ذریعے ہم کچھ نہ کچھ خوشیاں بکھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قہقہے بانٹنے والی شاعری اُداس ماحول میں ایک بہتر Contribution ہے۔

ارژنگ: آپ کی اب تک کوئی کتاب منظرِ عام پر اب تک آئی ہے کہ نہیں؟

خالد مسعود خاں: کتاب تو میری اب تک کوئی بھی شائع نہیں ہوئی ہے۔

ارژنگ: کالم نگاری کی طرف کیسے آئے؟

خالد مسعود خاں: کالم نگاری پر مجھے آمادہ کرنے کا سہرا ضیاء شاہد کے سر ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ ایک دفعہ لاہور ایئرپورٹ پر فلائٹ کے انتظار میں بیٹھا تھا اور ضیاء شاہد بھی وہیں تشریف فرما تھے۔ اتفاق سے فلائٹ لیٹ ہوگئی جس کے سبب مجھے اور ضیاء شاہد کو طویل گپ شپ کا موقع میسر آیا۔ اسی ملاقات میں انہوں نے مجھے کالم لکھنے کا مشورہ دیا۔ خیر بات آئی گئی ہوگئی۔ تھوڑے عرصے بعد ضیاء شاہد سے خبریں کے ایک مشاعرے میں دوبارہ ملاقات ہوئی اور اس بار انہوں نے مجھے کالم لکھنے کا مشورہ ہی نہیں دیا بلکہ مطالبہ بھی کیا کہ میں خبریں کے لیے کالم بھیجنا شروع کروں۔ انہی دنوں خبریں ملتان کا اجراء ہوا تھا اور جو ریذیڈنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے ان کے مجھے فون آنے شروع ہوگئے کہ آپ نے کالم لکھا کہ ابھی نہیں لکھا، لکھ دیا ہے تو بھجوا دیں۔ خبریں میں ایک دن جی کڑا کر کے کالم لکھ مارا اور سوچا کہ کالم چھاپ دیں گے تو ٹھیک ہے ورنہ کالم لکھنے کا مطالبہ چھوڑ دیں گے۔ یہ

۱۹۹۷ء کی بات ہے، مسلسل آٹھ سال تک میں نے خبریں میں کالم لکھا۔ اس کے بعد تھوڑی دیر اوصاف میں بھی لکھتا رہا۔ ایکسپریس سے بھی منسلک رہا اور پانچ سال سے روزنامہ جنگ کے ساتھ منسلک ہوں۔ صحافت میں آپ ضیاء شاہد کو میرا اُستاد بھی کہہ سکتے ہیں۔

ارژنگ: شاعر اور سیاسی میں آپ کو کون سا حوالہ زیادہ پسند ہے؟

خالد مسعود خاں: مجھے ذاتی طور پر شاعری کا حوالہ زیادہ خوشگوار اور پاورفل لگتا ہے مگر میں صحافت اور شاعری میں کوئی تضاد یا تصادم محسوس نہیں کرتا کیونکہ یہ دونوں ہی میری ذات کے حصے ہیں۔ نظام کی خرابیوں اور معاشرے کی ناہمواریوں اور برائیوں کے خلاف جو میرے اندر غصہ پیدا ہوتا ہے وہ صحافت کے ذریعے نکل جاتا ہے اور جو لطافت باقی بچتی ہے میں اسے شاعری کے قالب میں ڈھال لیتا ہوں۔

ارژنگ: آپ نے تعلیم کس شعبے کے متعلق حاصل کی؟

خالد مسعود خاں: تعلیم تو میں نے بزنس ایڈمنسٹریشن کی لی تھی۔ ایم بی اے کرنے کے بعد کچھ عرصہ اس شعبے میں ملازمت بھی کی مگر صحافت اور ادب کی طرف نکل آیا۔

ارژنگ: بحیثیت قوم ہم انقلاب کی طرف بڑھ رہے ہیں یا انارکی کی جانب یا پھر کسی اور طرف؟

خالد مسعود خاں: انقلاب کی طرف تو نہیں جا رہے ہیں۔ ہمارے اندر انقلاب کا جین (Gene) نہیں ہے۔ اگر حالات کو صحیح رُخ نہ دیا گیا تو انارکی کی طرف جانے کا امکان موجود ہے۔ صورت حال کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں کو حالات کی سنگینی کا احساس ہی نہیں ہے۔ ان کا مطمع نظر تو بس یہ ہے کہ کسی طرح آج کا دن اقتدار میں گزر جائے کل کی فکر نہیں۔ بلوچستان کا ایشو پیچیدہ صورت حال اختیار کرتا جا رہا ہے۔ بلوچ ہمارے دشمن نہیں ہیں مگر جب ہم ان کو شکوے، شکایتیں نہیں سنیں گے، حقوق غصب کریں گے تو وہ مزاحمت تو کریں گے۔ ڈرون کا معاملہ ہے، امریکہ سے کیے گئے معاہدے ہیں اور فاٹا کا ایشو ہے۔ یہ سب معاشرے کو انارکی کی طرف دھکیل رہے ہیں مگر میں Optimistic ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ حالات ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ ان حالات کو ٹھیک کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ تسلیم کرے کہ حالات خراب ہیں۔ جب حکومت مانتی ہی نہیں کہ حالات خراب ہیں تو پھر وہ اسے ٹھیک کیسے کرے گی۔ مسئلے کا ادراک ہوگا تو پھر ہی کوئی حل بھی نکلے گا۔ ورنہ تو یہ کرپشن اور بے ترتیبی ہمارے معاشرے کو انارکی کی طرف ہی لے جائے گی۔

ارژنگ: کون سے ادیب اور شاعر سے زیادہ متاثر ہیں؟

خالد مسعود خاں: تحریر کی پسندیدگی مستقل چیز نہیں ہے۔ کسی کتاب سے کمٹ منٹ بھی مستقل نہیں ہوتی۔ نیا شعر زیادہ مزہ دیتا ہے اور نیا شاعر بات کرتا ہے۔ ادب میں خاص پسند ناپسند چلتی رہتی ہے۔ مثلاً مجھے بچپن اور لڑکپن میں شفیق الرحمٰن نے اپنے حصار میں رکھا اور جوانی میں مشتاق یوسفی کے اسیر ہو گئے۔ ناول میں بانو قدسیہ اور اشفاق احمد پسندیدہ ہیں تو فضل کریم فضلی کا ناول بھی نظرانداز نہیں کر سکتا۔ دیوانِ غالب ہر بار نیا لطف پیدا کرتا ہے اور اقبال کا مطالعہ بھی مستقل رہتا ہے۔ نئے شعراء میں مجھے اظہر ادیب کی نظم بے حد پسند ہے اور نظم کے ہی شاعر معین نظامی کے علاوہ عباس تابش، فیصل عجمی اور بیرونِ ملک بسنے والے شاعر پسند ہیں۔ آپ کے علاوہ شوکت فہمی پسند ہیں۔

ارژنگ: شاعری کے فروغ میں مشاعرے کا کیا کردار ہے؟

خالد مسعود خاں: مشاعرے کی روایت ہماری بڑی تہذیبی روایت ہے۔ اسے جاری رہنا چاہیے۔ پہلے مزاح مشاعرے میں انٹرٹینمنٹ کے طور پر آتا تھا اب مگر مزاحیہ مشاعرے کا کلچر سامنے آیا ہے۔ میری رائے میں سنجیدہ شاعری اور مزاح کا مکس مشاعرہ زیادہ بہتر ہے۔

ارژنگ: پاکستان میں ادبی مراکز لاہور، اسلام آباد اور کراچی کو سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ آپ ان مراکز سے دور ملتان میں مقیم ہیں۔ کیا آپ کو اس دوری کا احساس ہوتا ہے؟

خالد مسعود خاں: میرا یقین ہے کہ میرٹ اور ٹیلنٹ کو روکا نہیں جا سکتا۔ صرف راستہ لمبا ہو جاتا ہے۔ اسلام آباد یا لاہور میں ہوتا تو الیکٹرانک میڈیا تک بھی باآسانی رسائی ہوتی جو کہ ملتان میں ذرا مشکل ہے۔ مگر میں ملتان میں بہت خوش ہوں۔ مجھے اس حوالے سے کوئی Regret پشیمانی نہیں ہے۔ کیونکہ لاہور اور اسلام آباد سے دور ہونے کے جہاں نقصانات ہیں وہاں پلس پوائنٹ بھی ہیں۔ کراچی کا نام میں نے دانستہ طور پر نہیں لیا کیونکہ کراچی کا مزاج میرے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔

دراصل ہم وہی چیزیں گنتے ہیں جو ہمیں نہیں ملتی ہیں۔ ان چیزوں کا شمار نہیں کرتے جو ہمیں حاصل ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملتان کا ہم پر حق ہے اور ہمارے اسی حوالے سے کچھ فرض ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ میرے کالموں میں بھی مقامی موضوعات چھائے رہتے ہیں۔ کیونکہ اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ اپنے اردگرد کے موضوعات پر بات کرے ہمارا کینوس چھوٹا ہو جاتا ہے۔ مجھے تو یہ بات عجیب لگتی ہے کہ بوسیریا اور چلی کی محرومیاں ہمیں رلاتی ہیں لیکن گردوپیش کے مسائل سے بے نیاز رہتے ہیں کہ ان پر اظہارِ خیال سے ہمارا کینوس چھوٹا ہو جاتا ہے۔

دوغلی زندگی گزارتے گزارتے......

اک سرمدی ملال کی حاجت ہے اور بس
کہنا ہے یہ کہ تم سے محبت ہے اور بس!

میں بیعتِ فریب نہ کرنے پہ ہوں بضد
میری اور اس کی اتنی عداوت ہے اور بس

اے قاسمِ سکون! بتا کیا کریں وہ لوگ
جن کو ہر ایک سانس کی اذیت ہے اور بس

جس نام کی لہو میں حرارت ہے موجزن
دھڑکن اسی کا ورد و تلاوت ہے اور بس

کی ہے بحث! مگر یہ سمجھ لیجیے مجھے
حرفِ غلط نہ سننے کی عادت ہے اور بس

ایسے کہاں ہیں شعر کہ جس طور دی ہے داد
یہ آپ ہی کا حسنِ سماعت ہے اور بس

(عاصم ثقلین درانی/بہاولپور)

صوفی!

عطاءالحق قاسمی

کل میری ملاقات ایک دوست سے ہوئی۔ برا حال بال بکھرے، داڑھی بڑھی ہوئی، ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی، رنگ اُڑا ہوا! میں نے پوچھا ''تم تو اچھے بھلے تھے۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

بولا ''عشق ہو گیا ہے''

میں نے کہا ''عشق میں یہ حال تو نہیں ہوتا!''

کہنے لگا ''یہی حال ہوتا ہے!''

پوچھا ''کیسے؟''

بولا ''ایسے کہ نظروں کے سامنے ہر وقت محبوب کا پیکر ہوتا ہے۔ ہر شخص میں اس کی تصویر نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ سے بہت پریشان رہتا ہوں۔''

میں نے کہا ''اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے؟''

''ہے نا، چند دن پہلے میں نے اسکوٹر کھمبے میں جا مارا۔ کیونکہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے بھی میرا دھیان اپنے محبوب کی طرف تھا۔ اسی طرح پرسوں میری پٹائی ہوتے ہوتے رہ گئی کیونکہ مجھے اس کی تصویر کسی اور میں نظر آ گئی تھی۔''

''یہ تو واقعی تشویشناک بات ہے......''

''صرف یہی نہیں بلکہ میرے گھر والے اور میرے دفتر والے مجھے پاگل بھی سمجھنے لگے ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ ایسے کہ میں بے خیالی میں اکیلے بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔ چنانچہ جو کوئی مجھے اس عالم میں دیکھتا ہے پاگل سمجھ بیٹھتا ہے۔''

''ایسے آدمی کو پاگل نہیں تو اور کیا سمجھا جائے گا؟''

''یہ بات تو میں بھی سمجھتا ہوں لیکن میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں مثلاً جب میں کھانا کھانے بیٹھتا ہوں اوّل کھانے کو جی نہیں چاہتا، جب زبردستی کھانے لگتا ہوں تو اس کی باتیں یاد آنے لگتی ہیں۔ اس کا چہرہ آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے جس کے نتیجے میں میرا معدہ خراب ہو گیا ہے۔ کئی دنوں سے حکیموں کی دوائیاں کھا رہا ہوں مگر وہ اثر ہی نہیں کر رہیں کیونکہ پیٹ خرابی کی وجہ تو اپنی جگہ ہے۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' میں نے بور ہو کر کہا۔

''مجھے پتا ہے اب تم بھی میری باتوں سے بور ہونے لگے ہو۔'' وہ بولا ''میرے سارے دوست میری باتوں سے بور ہو کر میرے پاس بیٹھنا چھوڑ گئے ہیں کیونکہ میں ان سے ہر وقت اس کی باتیں کرتا رہتا ہوں۔ مجھے اس پر بھی بہت ندامت ہے۔''

''ہونی بھی چاہیے'' میں نے اس بے وقوف دوست کی دل شکنی کے لیے کہا کیونکہ اس کی حالت واقعی تشویشناک تھی اور اسے اس حالت سے نکالنے کے لیے اس طرح کا سچ بولنا ضروری ہو گیا تھا۔

مگر لگتا تھا وہ اس طرح کی باتوں کا عادی ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا ''مجھے سب سے زیادہ غصہ کسی اور بات پر ہے!''

وہ شاید چاہتا تھا کہ میں پوچھوں کس بات پر! مگر میں چپ رہا۔ اس پر وہ خود ہی بولا ''میں بڑا خود غرض شخص تھا۔ اس دنیا میں، میں صرف اپنے لیے جیتا تھا، کھاتا پیتا تھا، عیش کرتا تھا، دوستوں میں بیٹھ کر قہقہے لگاتا تھا، سب مجھ سے خوش تھے۔ میں سب سے خوش تھا مگر جب سے عشق میں مبتلا ہوا ہوں میرے اندر بے لوثی اور بے غرضی آتی جا رہی ہے۔ میرا دل موم کی طرح نرم ہو گیا ہے۔ میں کوئی اچھی چیز کھاتا ہوں تو چاہتا ہوں کہ کاش وہ بھی پاس ہوتا اور وہ بھی اس کا ذائقہ چکھتا، کوئی اچھا منظر دیکھتا ہوں تو وہ منظر اسے بھی دکھانا چاہتا ہوں، کسی بات پر خوش ہوتا ہوں تو اکیلے خوش ہونا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اپنی اس خوشی میں میں اسے بھی شریک کرنا چاہتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے رومال سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ شاید نمی سی آ گئی تھی۔

میں نے اسے کاندھوں سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا ''کچھ اور بول، کچھ اور بتاؤ'' میری بوریت یک لخت ختم ہو گئی تھی اور مجھے یہ شخص اچھا لگنے لگا تھا۔

''اور یہ کہ وہ میری تنہائیوں میں بھی شریک ہو گیا ہے۔ میں اب خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا۔ میرے اندر ایک نئی قوت آ گئی ہے۔ اب میں طوفانوں کا مقابلہ بھی کر سکتا ہوں لیکن اس کے باوجود میں عشق سے چھٹکارا چاہتا ہوں کیونکہ وہ میری ہر چیز میں حصے دار بن گیا ہے جو میرے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔ ویسے بھی لوگ میری کیفیات پر ہنستے ہیں، میں نہیں چاہتا لوگ مجھ پر ہنسیں''

اس پر میں نے اسے مخاطب کیا اور کہا ''پہلے میں بھی تمہیں ترکِ عشق کا مشورہ دینے والا تھا مگر اب یہ مشورہ نہیں دوں گا بلکہ میرا مشورہ یہ ہے کہ اپنے عشق کی ریاضت تیز کر دو تاکہ اس کے نتیجے میں تمہیں لوگوں کا تم پر ہنسنا بھی برا نہ لگے۔ جب تم اپنی اس کمزوری پر قابو پا لو گے اور اپنی چیزوں میں محبوب کے علاوہ باقی خلقِ خدا کو بھی شریک کر لو گے تو تمہارا عشق مکمل ہو جائے گا۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''میں کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ ایک عاشق اور ایک صوفی میں جو نازک سا فرق ہے وہ صرف اتنا ہے کہ صوفی خلق خدا کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتا اور اپنے عشق کی تکمیل میں لگا رہتا ہے۔ تم نے باقی سارے مراحل طے کر لیے ہیں۔ جس دن تم نے لوگوں کے ہنسنے کی بھی پروا نہ کی اس دن تم صوفی ہو جاؤ گے۔ بک اپ، عشق جاری رکھو۔ میں ساتھ ہوں''۔

عیدی

حافظ مظفر محسن

بابو جا" تُو لیتی اب مجھے عیدی"

وہ رُوٹھ گئی!! میں نے بھاگ کر پاس جا کر منانے کی کوشش کی۔ وہ نہ مانی۔

"ایسے رُوٹھتے ہیں بھلا" میں نے منت سماجت کی مگر وہ چھوٹی گلی میں داخل ہو گئی اور دو منٹوں میں نظروں سے اوجھل بھی ہو گئی!

میں جلدی میں تھا اس لیے میں نے گاڑی سٹارٹ رکھی۔ لائبہ بیٹی اور بیگم جلدی جلدی قدم اُٹھائے سامنے کتابوں کی دکان میں چلے گئے۔

مجھے اک نہایت اہم میٹنگ میں جانا تھا جو شہر کے نظم و نسق کے لیے بلائی گئی تھی۔ صبح بھی میٹنگ ہوئی تھی اور میں اُس میں بھی دیر سے پہنچا تھا۔ جس پر سینئر افسر نے مجھے غصے میں گھورا بھی تھا۔ جو اس بات کا اشارہ تھا کہ ملک میں دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے واقعات حد سے بڑھ رہے ہیں اور عید پر اگر افسر اور عملہ اسی طرح سستی دکھاتا رہا تو حکومت کی اچھی ساکھ کو نقصان بھی پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ صبح والی میٹنگ میں دیر سے پہنچنے کا مجھے کوئی خاص افسوس نہ تھا کیونکہ نئے فون کی وجہ سے میں دل ہی دل میں خوش تھا۔ اچانک وہ میرے سامنے نمودار ہوئی۔ "دے باؤ عیدی دے دے۔ اللہ تیُوں حج کرائے۔ سوہنی شکل والیا" میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اُسے عیدی دے دوں مگر ایسے ضدی فقیروں کو میں ضدی بن کر پیش آتا ہوں۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کی نہایت خوبصورت فقیرنی تھی۔ میں نے آنکھیں اُس کے چہرے سے ہٹا لیں

"چور کہیں کی" وہ غصے میں آ گئی۔

"کیا چرایا ہے تیرا میں نے؟ پھر مسکرائی "دل تو چاہتا ہے تیرا دل چرا لوں۔"

"چل بھاگ" میں نے ہنستے ہوئے کہا

"نہیں جاؤں گی" شاید فارغ تھی یا مذاق کے موڈ میں تھی۔ رات گئے دن بھر کی مشقت کے بعد بھی تر و تازہ!!

"دے دے دے باؤ۔ کمینہ نہ بن" مجھے غصہ آ گیا۔

"چل دفعہ ہو۔ کوئی اچھا سا لڑکا دیکھ کر شادی کیوں نہیں کر لیتی۔"

"دے باؤ! تو کر لے مجھ سے شادی"

"حرام زادی! بھاگ یہاں سے" میں نے اپنے اصولوں کے خلاف اُسے گالی بک دی۔

میری گھڑی پر نظر پڑی تو میں گاڑی سے اُترا اور بیگم اور بیٹی کے پیچھے اُس دکان میں جا گھسا جہاں سے وہ سٹیشنری خرید رہی تھیں۔

وہاں بہت رش تھا۔ لڑکیاں گفٹ پیپر تھامے عید کارڈ اور دوسرے تحفے خرید رہی تھیں۔ مجھے خلیل جبران کا کرسمس منانا یاد آ گیا۔ لبنان میں خلیل جبران کرسمس بڑے شوق سے مناتا تھا اور پھر عرب دنیا اور یورپ امریکہ میں خلیل جبران کی کتاب "ٹوٹے ہوئے پر" کرسمس پر دیے جانے والا سب سے بڑا تحفہ سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے ہاں عید پر کمپیوٹر اور انٹرنیٹ آ جانے کے باوجود بھی عید کارڈز ڈالے جاتے ہیں اور اب ساتھ دوسرے تحفوں کا رواج بھی ہو چکا ہے۔ خاص طور پر کیک مٹھائیاں۔

میں نے بیٹی کو ہلکا سا ڈانٹا تو وہ ناراض ہو گئی "پاپا! یہ عید کے موقع پر بھی آپ کی میٹنگز جاری رہتی ہیں۔ ہمارے لیے تو آپ کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔"

میں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور جلدی آنے کی تاکید کر کے گاڑی کی طرف لپکا۔ وہ پھر سامنے آ گئی "دفع ہو جا۔ ورنہ پولیس کے حوالے کر دوں گا۔" اُس نے نیچے گاڑی سے باہر اشارہ کیا۔ بہت تیز ہے مجھے اُلجھا رہی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر نیچے اشارہ کر رہی تھی۔

چالیس ہزار کا نیا فون جو میں نے اپنی عید رنگین کرنے کے لیے خریدا تھا۔ جب میں غصے میں بیٹی اور بیوی کے پیچھے سٹیشنری کی دکان میں جانے نکلا تھا، گر گیا تھا۔ وہ چاہتی تو اس دوران اُٹھا کر غائب ہو جاتی مگر وہ شاید میری عدم موجودگی میں اُس کی رکھوالی کرتی اور اُسے اس نے چھوا تک بھی نہیں۔

میں نے جلدی سے فون اُٹھایا۔ اُسے صاف کیا اور اشارے سے اُسے بلایا۔ وہ آ گئی۔

"تم نے اُٹھایا کیوں نہیں؟"

"بابو! غریب ہوں۔ آج بھوکی بھی تھی۔ مانگ لیتی ہوں چوری نہیں کرتی۔ یہ ماں کا حکم ہے اور اللہ میاں بھی ناراض ہوتا ہے۔"

میں نے ایک ہزار کا نوٹ نکالا اور اُسے دینا چاہا۔

"نہیں بابو..... اب نہیں لوں گی۔ تم نے مجھے حرام زادی بھی کہا تھا۔"

"عیدی لے لو۔ معافی دے دو" میں نے درخواست کی۔ تو بیگم صاحبہ بھی آ گئیں۔

"مظفر! کس سے معافی مانگ رہے ہو؟"

"ابھی آ کر بتاتا ہوں۔ لمبی کہانی ہے۔" بیگم مجھے روک رہی تھی مگر میں اس کے پیچھے چل پڑا۔

"سوری! میں نے تمھیں عام فقیرنی سمجھا۔ تم تو بڑے کیریکٹر والی لڑکی ہو۔ رُک جاؤ۔ پلیز لے لو۔ تمہاری وجہ سے میرا نیا مہنگا خوبصورت موبائل فون واپس مل گیا اور میری عید پھیکی ہونے سے بچ گئی۔"

"تو بھی کوئی بندہ ہے۔ تجھے انسانوں کی پہچان بھی نہیں ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

وہ غصے میں پھر بولی "بابو! تُو لیتی اب مجھے عیدی" اور تیز تیز چلنے لگی۔

وہ روٹھ گئی۔ میں نے بھاگ کر پاس جا کر اُسے منانے کی کوشش کی۔ وہ نہ مانی۔

"ایسے رُوٹھتے ہیں بھلا"

میں نے منت سماجت کی۔ مگر وہ چھوٹی گلی میں داخل ہو گئی اور دو منٹوں میں نظروں سے اوجھل بھی ہو گئی اور میں ہاتھ ملتا واپس گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ اپنی ہار پر پچھتاتا ہوا۔

شعروادب

احسان دانش

شاعری قدرت اور ایجاد کے درمیان کی ایک خاکنائے ہے جس سے غیرمرئی اور مجسم چیزوں میں ایک واسطہ اورحقیقت ومجاز میں ایک رشتہ قائم ہوتا ہے۔

شاعر کی زبان الفاظ کے پھول اور تشبیہات کی جالیاں کاٹنے کی علمی مقراض ہے جس پر ادب کی آب ہوتی ہے۔ یہی ایک ایسا اوزار ہے جو دل میں پیدا ہونے والے غیرمرئی خیالات، جذبات اور اندازوں کو آنکھوں اور کانوں کی نشرگاہ میں لاتا ہے جہاں سے بے شمار معاشی اسٹیشنوں اور روحانی اڈوں کو راستے جاتے ہیں۔

شاعر زبان کی فیکٹری کا مالک اور ادب کے معمل کا انچارج ہوتا ہے۔ ہر دور کا ادب اس زمانے کی صحیح روداد ہوتی ہے جو خودبخود شاعر کی زبان پر بولتی اور قلم سے ٹپکتی ہے۔ شاعر سے زبان کا اور زبان سے شاعر کا معیار پرکھا جاتا ہے۔ ہر دور کا شاعر اپنے دور کی زبان کا امین اور ایسا امین ہوتا ہے جو امانت کو بہ اضافہ واپس کرتا ہے۔ اگرچہ یہ اضافہ اُس کے فرائض میں نہیں ہوتا لیکن فطرتاً اُس کے کارنامے اس کا ثبوت ہوتے ہیں!

جب شاعر مادی دُنیا سے آگے نکل جاتا ہے تو شاعری مادی دُنیا میں وارثوں کی طرح اس کا ماتم کرتی ہے۔ اگرچہ شاعر کی زندگی ہی میں اس کے گورکن اور کفن کھسوٹ پیدا ہو جاتے ہیں اور مرنے پر بے روک ٹوک اس کے خیالات دوسرے مقلد شاعروں کے گلے میں داخل ہوتے ہیں۔

تحقیق اُنہیں اصل شاعر کے نام سے مشکوک نہیں کرتی مگر شہرت کا چسکا نہ جانے اس مواد کو کن کن رنگوں میں رنگ کر بے پہچان کرنا چاہتا ہے۔

شاعری صرف اس کلام موزوں کو ہی نہیں کہتے کہ جس میں ردیف وقوافی مختلف مضمون حسن اور سلیقہ سے نظم ہوں بلکہ شاعر ہر پوشیدہ چیز کو خوبصورتی سے عوام میں لانے اور ہر نئی چیز ایجاد کرنے والے کو کہتے ہیں۔ خواہ وہ امیر ہو یا غریب جاہل ہو یا عالم کمزور ہو یا طاقتور، ایجاد کا حامل اور واقعات و حالات کا امین ہونا اس کی شرط ہے۔ مقلدین اکثر مقامات پر موجدوں سے اُونچے اور سرسبز نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ان کے یہاں ان کا سرمایہ متقدمین اور معاصرین کے انتخاب پر موقوف ہوتا ہے۔ ان میں فطری طور پر طبع زاد چیزوں کی صلاحیت نہیں ہوتی یا یوں کہیے کہ اپنے لیے زمین کو بونے اور جوتنے کے قائل نہیں ہوتے۔ بلکہ چڑھی ہوئی زمینوں سے خوشہ چینی کرتے ہیں۔ وہ نئی سڑکیں ایجاد کرنے کے اہل نہیں ہوتے بلکہ ڈگڑوں ڈگڑوں پھر کے ایک مقام سے دوسرے مقام کا راستہ تلاش کرتے ہیں اور کچے راستوں کو شاہراہوں سے نزدیک اور بےضرر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی جعلی بلندی میں پیشروؤں کے خلاف ایسا مواد ہوتا ہے جس کا حصار لگا کر وہ اپنی ذاتی پستیاں چھپا سکیں۔

بعض مقلد تو انتہا درجے کے ذہین اور بے پناہ قسم کے موزوں طبع ہوتے ہیں۔ وہ پیشروؤں اور ہم عصروں کے درمیان ایک ایسی فضا پیدا کر ڈالتے ہیں کہ زمانہ اسے کوئی نہ کوئی نیا نام دینے پر مجبور ہو جاتا ہے خواہ وہ ماضی کی شہ رگ سے ٹپکا ہوا حال کا لہو کیوں نہ ہو!

مقلد میں تحقیق کا مادہ نہیں ہوتا۔ وہ متقدمین کے انبار کی چھان پھٹک اور معاصرین کی تلچھٹ نکالنے پر رہتا ہے۔ اس کے مداح، اس کے دوست اور صرف دوست اور اس کے مقام سے بلند آدمی اس کے حلقہ معلومات سے باہر رہتے ہیں۔ وہ موقع پا کر اُن پر تخریبی تنقید بھی کرتا رہتا ہے جس میں ایک پہلو سے اس کی جھوٹی قابلیت کا پروپیگنڈہ بولتا ہے!

حقیقی شاعر ان تمام چیزوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ کم آمیزی اور سحرخیزی اس کے اوّلین اوصاف ہیں۔ اس کے افکار و تصورات عوام کے انداز فکر اور طریق تصور سے مختلف ہوتے ہیں جنہیں الگ وجود میں آنے کے بعد سمجھتے ہیں وہ اپنے بلند مچان سے فطرت کو آواز دیتا ہے اور اس کی بازگشت کا سایہ مقلدین میں جان ڈالتا چلا جاتا ہے اور یہ کچے دھاگوں کے تار پر ناچنے والے پتلے اصل مرکز سے اقتباسات کی بھیک مانگنے لگتے ہیں۔ اس کے چہرے پر ماہ وسال اپنے نقش قدم اور روح پر جوہر چھوڑتے ہیں اس کا ظاہر کسلمند اور باطن شاداب ہوتا ہے۔ وہ مصائب کی قیمت اور فاقوں کی عظمت کو سمجھتا ہے۔ اس کی نظر میں جاہ وحشم کے طالب اور منصب و مقام کے متلاشی حقیر اور بے قیمت ہوتے ہیں۔ اس کے ساز سے حقائق کے نغمے بلند ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو سوز کی شدت اور اثر کی حدت سے تار پگھل جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ تار اُس چاندی کے ہوتے ہیں جو فولاد سے نکالی جاتی ہے۔

حقیقی شاعر کی زندگی عبادت سے عبارت ہے۔ اس کی آگ میں خوشبو پانی میں روشنی، مٹی میں جان اور ہوا میں حس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسان فطری شاعر نہیں ہوتا۔ کیونکہ شاعر فیکٹری کی چیز نہیں یہ تو پیدا ہوتا ہے۔ اس کی رُوح گلوں کی عادی نہیں ہوتی اور تنہا آسمانوں کی پہنائی غاروں کے سکون اور نباتات و جمادات کے نشوونما سے سرگوشیاں کرتی اور اپنے راستے پر محبت کے خوابوں کے حاشیے لگاتی انسانی درسگاہوں کی طرف چلتی ہے تاکہ ادب کو وسعت، لغت کو جامعیت، سیاست کو بصیرت اور مذہب کو ہردلعزیزی عطا کردے۔ شاعری کہیں کہیں تو لغت کا ساتھ دیتی ہے اور کہیں کہیں یہ لغات سے بلند اور اس کے احاطہ سے باہر کی بات کرتی ہے جسے لغات میں آتے ہوئے زمانہ لگ جاتا ہے۔ محاورات اس سے چوراہوں پر متعارف ہوتے ہیں اور تشبیہات اس کے ذہن اور مناظر کے میل سے پیدا ہوتی ہیں۔ نقال یا مقلد کے الفاظ میں تاثیر نہیں ہوتی کیونکہ اس کے گودام میں تمام برتی ہوئی چیزیں ہوتی ہیں۔ اس کی فیکٹری کا مال کچھ دنوں تو نیلام گھروں کو توسل سے درمیانہ درجہ کے گھروں میں ملتا ہے پھر پرانی وردیوں اور گلے سڑے چمڑے کے صندوقوں کی طرح کباڑیوں کی دکانوں تک رہ جاتا ہے اور پھر کچھ دنوں کے بعد گھوڑوں پر، وہ اس سے مطلق ناآشنا ہوتا ہے کہ اس گمنام کن شہرت اور بدنام کن نکوکاری سے زندگی اور اس کا ہر شعبہ مسموم ہو رہا ہے۔ اس کی محدود نظر وقت کے جادہ پر مستقبل کی طرف سفر نہیں کرتی۔ یہ کم سواد اور ماضی کا پھسپھسا کارنامہ حال کے ہونٹوں پر لرزتا رہتا ہے۔ اگر یہ اپنا مذہب بدل دے اور اپنے

اُس لمبے سائے کی طرف نہ دیکھے جو وقت کے ساتھ چھوٹا ہوتا رہتا ہے تو شاعری کے علاوہ اور بہت سی کارآمد شاخیں ایسی ہیں جو ادب میں بہت بلند مقام رکھتی ہیں اور افادی طور پر قوم، ملک اور زبان کے لیے پھیپھڑوں کا کام دیتی ہیں۔

یہ لوگ کم ہمتی کے باعث اپنی اُن صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاتے جو پہاڑوں کے ضمیروں سے مجسمے اور موسموں کے حمل ان دیکھی دولت حاصل کرسکتی ہیں مگر یہ تو آنکھیں رکھتے ہوئے بھی دوسرے کی لاٹھی پکڑ کر چلنے کے عادی ہوجاتے ہیں۔ انہیں قصائد کی چاٹ اور سپاسناموں کا چسکا پڑ جاتا ہے۔ یہ آئے دن دولتمندوں کے درباروں اور حکام کے دروازوں پر ملاقاتی کارڈ لیے گھومتے رہتے ہیں۔ حالانکہ اُن کی نظر میں بھی ان کا مقام کوئی بلند نہیں ہوتا!

اس میں شک نہیں کہ اجنبی زبانوں کے اجنبی لہجے اور فقروں کی ساخت سماعت اور زبان کے لیے غرابت پیدا کر دیتی ہے اور اس میں یک نظر کوئی دلکشی دکھائی نہیں دیتی لیکن معانی کی لطافت اور ہمہ گیری اسے نظر انداز نہیں کرنے دیتی اور آخر کثرتِ استعمال میں آ کر الفاظ کے کھر درے پہلو گھس جاتے ہیں۔ جتنے دن گزرتے جاتے ہیں روانی بڑھتی جاتی ہے اور مختلف موقعوں پر سلیقہ استعمال اُسے ہر دلعزیز بناتا چلا جاتا ہے۔

تقسیم سے پہلے اس ملک میں دو زبانیں بستی تھیں۔ ایک اُردو دوسری ہندی اور دونوں میں اس قدر قرابت اور عزیزداری ہوگئی تھی کہ جب ایک زبان کا لفظ دوسری زبان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر نکلتا تھا تو دونوں ماں جائے معلوم ہوتے تھے۔ اس اتحاد اور ہمسائیگی کی یادگار میں ہمارے یہاں لاپتا، موتی محل، امام باڑہ، بارہ وفات، کفن چور، عجائب گھر، جیب گھڑی، پنچ فیصلہ وغیرہ کی قسم کے بے شمار الفاظ ہیں اور رہیں گے لیکن خام فرقوں کا تعصب اس لسانی اتحاد میں بھی فاصلہ چاہتا ہے۔

ملک تقسیم ہوا تو اراکین نفاق نے اُردو کو بھی مسلمان سمجھ کر دیس نکالا دے دیا اور اب یہ مہاجر کی حیثیت سے یہاں دوسرے پناہ گزینوں کی طرح دربدری کی زندگی بسر کر رہی ہے جن کے گھروں میں یہ پلی بڑھی اور پروان چڑھی وہ غریب خود پریشان حال اور خانماں خراب ہیں تو اس کی دیکھ بھال کیسے کریں لیکن یہ فطری زبان ہے اور فطرت لازوال۔

اُردو زبان کے لطیف اور لوچدار الفاظ دکانوں، دفتروں اور بازاروں میں اکثریت کی زبان کے جھلبھلاتے لہجوں سے دبکتے اور شرماتے پھرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آئندہ نسل میں اکثریت کی زبان اپنے طول وعرض پر نظر کر کے اس کی پناہ گیری سے فائدہ اُٹھائے اور تعاون پر آمادہ ہو جائے لیکن فی الحال تو اس زبان کے سینکڑوں ستونوں کو توڑ توڑ کر ناقص بنیادوں میں بھرا جا رہا ہے اور یہ کوشش تخریب بیکار!

یہ نہیں کہ اس خانہ بدوش زبان میں ادب نہیں ملتا۔ مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تو ایسے ایسے جواہر ریزے مٹی میں ملے ہوئے ہیں کہ دوسری زبان کے ان بلند بانگ لوگوں کے یہاں اس کا عشر عشیر بھی نہیں جو ہچو ما دیگرے نیست کا نعرہ بلند کرتے پھرتے ہیں اور بحث کرتے ہوئے جب کہیں تحقیق کے جھکڑ چل پڑتے ہیں تو ان کے علمی فرغلوں کے دوطرفہ دامن اُڑنے لگتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نیچے سے اُوپر تک کا ایک ہی لباس ہے مگر شاید مخالفت کو وہ جزو مذہب بنا چکے ہیں۔

ہر زبان کی دیہاتی شاعری جسے گنواروں کی اُجڈ زبان بتایا جاتا ہے اتنی لطیف اور سادہ ہوتی ہے کہ اس میں خلوص ہی خلوص اور حسن ہی حسن نظر آتا ہے اور کوئی زبان بھی اُسے اپنانے اور قبول کرنے سے انکار نہیں کرسکتی۔ کیونکہ صداقت تو ہر جگہ صداقت ہے اور تاریخ ادب کی ہر بلندی اس کی متمنی! لیکن اس ماحول میں تو ہر نشیب میں خود پسندی کا پرچم بلند ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ آئندہ نسل سے پہلے ہی اس کا مرحوم ماضی اس کا رُخ مستقبل کی طرف پھیر دے لیکن اس اُمید کا چراغ ذرا سنبھالا لے کر پھر جھونکوں میں لرزنے لگتا ہے۔ کیونکہ ابھی یہاں عوام میں مستقبل کے انسان ناپید ہیں اور فطری قدریں قبول نہیں کرتے۔

اس میں شک نہیں کہ ہماری زبان میں آئے دن غیر زبانوں کے الفاظ اصطلاحات، محاورات، تشبیہات اور تلمیحات شامل ہوتے جا رہے ہیں جن میں کچھ نرم ہیں اور کچھ سخت، کچھ لوچدار ہیں اور کچھ کرخت، کچھ ملائم ہیں اور کچھ ثقیل۔ اس سے ہمیں گھبرانا نہیں چاہیے کیونکہ ہماری زبان کی ایسی نشوونما ہے کہ ضعیف لغت اور سست رفتار قواعد اس کے ساتھ نہیں چل سکتے اور روز بروز قواعد کی چار دیواری سے باہر کی لفظی مخلوق بڑھتی معلوم ہوتی ہے اور یہ ہیں حقیقت میں آثارِ حیات۔ ہمارے پاس جس قدر اصول وقواعد موجود ہیں اگر مذاق سلیم ساتھ دے تو انہیں اوزاروں سے بہترین آرایش ہوسکتی ہے جنہیں ہم اپنی ضرورت کے لیے ناکافی سمجھ رہے ہیں۔ اس سے یہ مقصد نہیں کہ دیگر زبانوں کا ادب سر سے پاؤں تک طاری کر لیا جائے اور اس کو اوڑھنا بچھونا سمجھ بیٹھیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر ملک کے تمدن اور زبان وادب میں حسن موجود ہے لیکن سراپا حسن کسی بھی ملک کو نہیں کہا جاسکتا۔ اعتدال ہی کا پیمانہ صحیح پیمانہ ہے!

ہمیں اپنے یہاں کے مقامی الفاظ اور قصباتی محاورات سے بھی غافل نہ ہونا چاہیے۔ یہ بھی ایک بڑی تلخ گمراہی ہے۔

کیونکہ جب یہ روزمرہ اور محاورات دوسری زبانوں کے سائے ہیں۔ برمحل استعمال ہوتے ہیں تو تقریر اور تحریر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ نیز کلام وقلم میں تاثیر کی کمی نہیں رہتی اور فصاحت و بلاغت کا ایسا قوام بن جاتا ہے جس میں یکسانیت ہونے کے باوجود سوز ونغمہ کے عناصر ناپے تولے جاسکتے ہیں۔

حکومت اگر ملک بھر میں درسگاہیں اور تعلیمی مراکز ایک افادی نقطہ نظر سے قائم کردے جس میں حقیقی والدین کی طرح سب پر دست شفقت رہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے مذہبی اور سیاسی نظریات میں اتحاد پیدا نہ ہو اور جب اتحاد ہو گیا تو تمام فرقہ وارانہ مناقشات کالعدم ہو جائیں گے۔ کیونکہ ہر شخص کے سامنے تعمیری سوال رہے گا۔ وہ کسی بھی شعبہ کا کیوں نہ ہو ہر شخص اپنے حلقے کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرے گا!

اگر نظامِ تعلیم اس انداز کا ہوگیا تو ڈگریوں کے لحاظ سے ہمارے ملک میں ایک موسم بہار کے بعد معلوم ہوگا کہ ہر نوجوان خواہ وہ کسی قریہ سے تعلق رکھتا ہو ملک کا سپوت اور فرمانبردار بیٹا ہے اور افراد کے اجسام علیحدہ ہوتے ہوئے تمام کے تمام محبت کی ایک زنجیر میں منسلک ہیں جو دوسرے ملکوں کو زبانوں اور فنون سے اپنے ملک کی بہبود کا تہیہ کیے ہوئے ہیں!

ایسی صورت میں ادب وشعر کا معیار بھی قومی صلاحیتوں اور مقاصد عالیہ کے لحاظ سے مقرر ہوگا۔ اس میں کورانہ تقلید کی دشواریاں اور پیچیدگیاں نہیں ہوگی کیونکہ نظام کی صحت ہی سے تو مستحکم قومیت اور صداقت قائم ہوتی ہے۔

میں دریافت کرتا ہوں کہ نظامِ تعلیم درست ہو جائے تو پولیس کی ضرورت کس حد تک باقی رہ جاتی ہے؟

✪✪✪ (بشکریہ محمد فرزان دانش)

حسن کا حُسنِ تحریر

نیلم احمد بشیر

بھولی صورت تیا والے حسن عباسی سے میں بہت شرمندہ تھی۔ محفلوں میں ملتے تو اکثر کنّی کترا کے نکل جاتی۔ وجہ اس کی صرف یہ تھی کہ مجھ پر ان کا ایک قرض تھا جسے میں باوجود خواہش کے ادا نہ کر سکی تھی۔ اپنے پہلے سفرنامے میں محبت کے پروں میں گھنٹیاں باندھے وہ ہندوستان کی سیر کو نکلے تھے اور کیا کیا اُڑانیں لی تھیں انہوں نے مجھ سے کہا کہ ان کی کتاب پہ اظہارِ خیال کر دوں لیکن میں اپنی ریزہ ریزہ بے معنی مصروفیات کی وجہ سے لکھ نہ سکی جس کی وجہ سے میں ان سے منہ چھپاتی پھرتی تھی۔

ایک دلچسپ سفرنامہ تحریر کرنے کے بعد انہوں نے یہ دوسرا البریز سفرنامہ ''ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا'' اپنے ہاتھوں سے لکھا اور پڑھنے والوں کے دلوں پہ رقم کر دیا ہے۔ اب کی بار تو مجھے جم کر بیٹھنا اور پڑھنا ہی تھا مگر یہ پڑھنا طبیعت پر کوئی جبر نہیں تھا۔ تحریر اتنی خوبصورت، ملائم، دل آویز، جذبوں میں بھیگی بھاگی تھی کہ کتاب خود ہی اپنے آپ کو پڑھواتی چلی گئی۔ میرے نزدیک کسی کتاب کی اس سے بڑی کوئی دلیل نہیں کہ وہ آسانی، سادگی سے آگے بڑھے اور قاری کی توجہ کو تمام وقت اپنی گرفت میں رکھے۔

دبئی کا یہ سفرنامہ ہے کہ بائیسکوپ کا ونڈرفل تماشہ جس میں سے ہم رنگ برنگے عکس جلتی ہوئی روشنیوں، منظم سڑکوں، فرحت بخش سیر گاہوں کے مناظر دیکھتے ہیں تو جی للچانے لگتا ہے کہ کاش ہم بھی وہیں ہوتے۔ موجود اور مصروف، حسن عباسی کے ساتھ ساتھ۔ آج دبئی ترقی کے زیور ماتھے پہ سجائے بلاشبہ ایک قابل فخر بین الاقوامی تجارتی مرکز اور تفریحی مقام کے طور پر دنیا بھر میں اپنی حیثیت و انفرادیت تسلیم کروانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ یہاں کے رہنے والے پاکستانی لوگ پاکستانی شاعر و شاعرات کو مدعو کرتے ہیں۔ اچھی خوبصورت جگہوں پہ ٹھہراتے، سیریں کرواتے ہیں۔ ان کا کلام سنتے ہیں اور روح کی تسکین پاتے ہیں۔ پس حسن بھی ایک مشاعرے کے سلسلے میں ہی یہاں گئے تھے۔

وہاں جو کچھ انہوں نے دیکھا اسے دل سے محسوس کیا اور لکھا۔ ایک خشک، گرم، ریتلے ملک کا مشاہدات و تفریحات سے تر بیان کتاب پڑھنے والوں کو ہمہ وقت تحیر آمیز تجسس اور سحر میں گرفتار رکھتا ہے۔ عجیب بات یہ بھی ہے کہ اس کتاب میں دبئی کی بھابیوں کے ہاتھ کے پکے ہوئے پلاؤ، زردے کا تذکرہ کہیں نہیں ملا۔ یاد رہے یہ وہی پلاؤ ہے جس کا اکثر شاعر کالم نگار حضرات واپس آ کر اپنے کالموں میں ذکر ضرور کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ بڑا انوکھا سفرنامہ ہے۔

کتاب کا ٹائٹل نیلے رنگ کا ہے اور نیلا رنگ آسمان اور سمندر دونوں کا ہوتا ہے۔ اس سفرنامے کو پڑھ کر علم ہوا کہ دبئی ایک ایسا ملک ہے جہاں ایک نقطے پر آ کر صحرا اور سمندر کا وصال ہوتا ہے اور پھر وہ ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔ بالکل اسی طرح جیسے انسان کے بھیتر میں بھی ایک صحرا اور ایک سمندر چھپے ہوتے ہیں جو ہمیشہ ایک دوسرے سے جڑے رہتے ہیں الگ نہیں ہوتے۔

ٹائٹل بہت دل آویز ہے۔ ایک تصویر برج الخلیفہ کی ہے جو اب دبئی کی پہچان بن چکا ہے اور ایک کسی اور عمارت کی۔ پھر دو کھجور کے درخت ہیں جو کافی رومانوی انداز میں ایک دوسرے کے قریب کھڑے ہیں اور درمیان میں معصوم صورت حسن عباسی نظریں نیچی کیے بیٹھے ہیں۔ شاید یہ تصویر اس لمحے کی ہے جب انہوں نے ساحل سمندر پہ چند گوریوں کم لباسوں کو غسل آفتابی کرتے چوری چوری تک لیا تھا۔

اس پہ تو میں یہ ضرور کہوں گی کہ ''دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار، میر صاحب زمانہ نازک ہے'' بھیا عورت کم لباس ہو یا سرتاپا برقعہ پوش، ایسے مواقع پہ اپنا ایمان سلامت رکھئے، استقامت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں تو آپ کو کچھ بھی عجیب نہیں لگے گا۔ یہ معاملہ اور مسئلہ ہمارے ہاں کے مشرقی مردوں کا ہے کہ عورت نے کیا پہن رکھا ہے اور کیا نہیں؟ مغربی ممالک میں ان کی اپنی خواتین کم سے کم لباس ہوتی ہیں اور مسلمان خواتین اب بہت زیادہ برقعہ پوش مگر ان کا کوئی مرد کسی کو آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا۔ اس کی آنکھ میں کوئی ہوس ہی نہیں ہوتی۔ گورے مردوں کو کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ راہ چلتی عورت کا لباس کیسا ہے؟ تو صاحب یہ تو آپ کے اپنے دل اور نگاہ کا معاملہ ہے۔ ویسے اور بھی دکھ ہیں زمانے میں عورت کے جسم کے سوا۔ بس دھیان ادھر ادھر کر لینے میں ہی خیریت رہتی ہے۔

مجھے اقرار ہے کہ کتاب کے ورق پلٹتے گمان گزرا کہ دبئی کا سفرنامہ بھلا کیا سفرنامہ ہوگا؟ ایک ایسا ملک جہاں سب اچھا ہے کی روداد آخر کیا ہوگی؟ ہم سب جانتے ہیں کہ وہاں دنیا بھر سے سیاح آتے ہیں، کھاتے پیتے، موج اُڑاتے ہیں، قوانین کی پاسداری ہوتی ہے، بلند و بالا پرشکوہ عمارات کا جاہ و جلال نظر آتا ہے۔ ہندی، پاکستانی، بنگلہ دیشی اور تیسری دنیا کے دیگر غریب ممالک کے مزدوروں کا شدید گرمی اور دھوپ میں اپنے تن کا سونا پگھلانا دل کو دُکھاتا ہے۔ یہ سب معلوم تو ہے تو بھلا اس سفرنامے میں اور کیا ہوگا مگر ماننا پڑے گا کہ جوں جوں کتاب پڑھتی گئی پٹاری کھلتی چلی گئی۔ نت نئی دلچسپیوں، رنگینیوں، لطافتوں کے سامان باہر آتے گئے اور تجسس قائم رہا۔

حسن کی کتاب سے مجھے پتہ لگا کہ دبئی ماضی میں کوئی اہم تہذیبی گہوارہ رہ چکا ہے۔ جس کے آثار اب برآمد ہو چکے ہیں۔ جمیرا بیچ Beach قدیم ساحلی پٹی ہے جہاں ہمیشہ سے مچھیرے موتی تلاش کرتے ہیں اور یہ عمل آج تک جاری ہے۔ حسن کا سفر ان کے اپنے اندر کا سفر ہے۔ وہ خود ہی اپنے ہم رکاب، اپنے سفر پہ روانہ، اپنے ہی راز داں ہیں۔ ان کی ذاتی دلچسپی کی جگہیں اور باتیں اُنہیں گرفت میں لے لیتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے الحمر رجھیل نما خاموش سمندر لارنس باغ کی پراسراریت کی یاد دلا گیا جو کہ ظاہر ہے کہ ان کا اپنا ایک ذاتی احساس اور تصور تھا۔ کسی اور کا وہ خیال شاید نہیں ہو سکتا ہو۔ یہ بات کتنی سچ ہے کہ ہم جب سفر کو اختیار کرتے ہیں تو دراصل ہم اپنے آپ کو سفر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ پھر جو ہو سو ہو۔ وہی ہوتا ہے جو سفر چاہتا ہے۔ یوں سفر ہم پر اختیار حاصل کر لیتا ہے۔ حسن عباسی کے ساتھ گو کہ اور لوگ

بھی تھے مگر لگتا ہے کہ یہ سفر وہ اپنی ذات کے ہمراہ ہی کر رہے تھے۔ تنہا تنہا اکیلے اکیلے۔

وہ اپنے ایک الگ منفرد، خیالی، رومانوی، آسودگی بخش، اتفاقات سے بھرے سفر کے تجربے میں گھر جاتے ہیں اور پھر جب واپس آ کر اپنی زنبیل اُلٹا کر اپنے محسوسات کو کاغذ پہ بکھیرتے ہیں تو ہر حرف آبدار موتی کی طرح جگمگانے لگتا ہے۔ سفر انہیں اپنے جلو میں لیے، بہاؤ میں بہاتا لیے چلا جاتا ہے۔ چلتا اور چلاتا رہتا ہے۔ نئے نئے انکشافات کے در وا ہوتے رہتے ہیں اور سامنے کے پردہ سیمیں پر مناظر تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ سفر میں کشٹ تو اُٹھانے پڑتے ہیں مگر جو لذت اور طمانیت اس دوران حاصل ہوتی ہے وہی بالآخر اس کا انعام بھی ٹھہرتی ہے اور اسی لیے ہم سب سفر کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں چاہے ہمیں وہ کتنا کٹھن اور مشکل کیوں نہ لگے یہ تو طے ہے۔

کہیں کہیں تو مجھے حسن عباسی ایک حیران آنکھوں والا وہی پرندہ لگتا ہے جو اپنے پروں پہ نظمیں لکھ کر، پیروں میں گھنٹیاں باندھے دور دیس جا نکلتا ہے اور پھر روزمرہ کی زندگی میں واپس لوٹنا نہیں چاہتا۔ کتاب میں جابجا ٹکے شاعری کے خوبصورت نگینے یاد دلاتے رہتے ہیں کہ حسن عباسی اپنے اندر کے شاعر کے خیال سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ وہ یوں اسے اپنے ساتھ رکھتے ہیں جیسے اگلے زمانے میں لوگ مخمل کی ڈبیا میں بیر بہوٹی کو اور آج کے دور میں موبائل فون کو جیب میں رکھتے ہیں اور گاہے گاہے نکال کر اس کے پاس ہونے کا یقین کرتے رہتے ہیں۔

برج العرب عمارت کا تذکرہ کتاب میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا میں نے بھی اسے بہت دلچسپی سے پڑھا اور سر دُھنا۔ حالانکہ مجھے جدید فیشن ایبل عمارتوں سے کوئی خاص رغبت نہیں ہے۔ مجھے تو سمندروں کے نگلے ہوئے شہر اور ریت میں دھنسی مدفون تہذیبیں اپنی طرف بلاتی ہیں۔ میں نے ماضی میں امریکہ کی ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ، ورلڈ ٹریڈ سنٹرز، شکاگو کا Sears ٹاور اور ٹورنٹو کا سی این ٹاور بھی دیکھ رکھا ہے مگر حسن عباسی نے برج العرب کا ایسا فیسی نیٹنگ نقشہ کھینچا ہے کہ مجھ جیسی کافر بھی مسلمان ہونے کو تیار ہو گئی۔ میرا جی چاہا چھلانگ مار کر برج العرب کی آخری منزل تک جا پہنچوں اور نظارہ کروں وہاں سے سمندر اور آسماں کا، انسان اور خدا کی تخلیق کے مظاہر کا اور پھر انہی کا ایک حصہ بن کر معدوم ہو جاؤں۔ اچھی تحریر کی طاقت بس ایسی ہی ہوتی ہے۔

ویسے یہ حیرت کی بات تو ہے کہ دُبئی کے شاہوں نے اپنے سمندر کو کاٹ کر اس میں ایسی ایک عمارت کھڑی کر دی ہے جس نے آسمان چھو لینے کی کوشش کی ہے۔ یقیناً خدا بھی یہ سوچ کر عالی دماغ حضرتِ انسان سے متاثر تو ہوتا ہوگا۔ مگر پھر شاید وہ یہ بھی سوچتا ہو کہ انسان کو خدا سے ہم کلام ہونے کے لیے ہمیشہ کسی کوہِ طور پہ چڑھنے کی ہی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔ شاید اس مورکھ کو یہ علم نہیں کہ خدا کو ڈھونڈنا ہے تو اِک ذرا اپنے دل میں ہی جھانک کر دیکھ لے۔ زمین پر گرے پڑے کیڑے مکوڑے جیسے انسانوں، ڈوداں مچھیاں میں ہی تلاش کر لے۔ اتنی اونچی اونچی عمارتوں پہ چڑھنے کی اسے ضرورت نہیں۔

میں نے زندگی میں بہت سے رنگ رنگیلے، مستیلے شہر دیکھے ہیں۔ ان کے جلوؤں سے اپنی آنکھیں خیرہ کی ہیں مگر چند بار دبئی جانے کے باوجود دبئی سے اس طرح کبھی متعارف اور مسحور نہیں ہو سکی جس طرح حسن عباسی کے سفرنامے کو پڑھنے کے بعد ہوئی ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے ہمیشہ مختصر سا ہی وقت وہاں گزارا ہے۔ کسی خوبرو جوان رعنا نے مجھے (اب باریش بڑھا بابا بھی ہو سکتا ہے) یوں شہر گھمانے پھرانے کی نہ کبھی دعوت دی اور نہ ہی سرخ قالین میرے قدموں میں بچھایا اسی لیے پھر مجھ جیسی خود کو ابدی سنڈریلائیں سمجھنے والیاں اپنے بلوری شیشے کے واحد سینڈل کو ہاتھ میں تھامے اچھے وقتوں کا انتظار کرتی بیٹھی رہ جاتی ہیں اور چڑیاں چگ جاتی ہیں کھیت۔ ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہم سے کتنے کتنے خوبصورت تجربات اور نظارے اوجھل رہ گئے ہیں۔

میرا ذاتی خیال تھا کہ دُبئی میں ایسی کون سی خاص بات ہوگی کہ اس کا سفرنامہ تحریر کیا جا سکے۔ شاپنگ مالز، کالے سرے سے بھری عربی خواتین کی بے اعتنا آنکھوں کے سوا وہاں رکھا ہی کیا ہوگا۔ مگر یہ کتاب پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ دیدہ بینا ہو تو بہت کچھ دکھائی دے جاتا ہے۔ صحرا میں سیپ مل جاتے ہیں اور سمندر میں جل پری۔ ہوائیں گرم بھی چلتی ہوں تو خوشبودار پرفیومز کی ٹھنڈی مہک پھر بھی آپ سے آ لپٹتی ہے۔ مجھے عربی لوگوں سے کبھی کوئی لگاؤ محسوس نہیں ہوا۔ کیونکہ ان کی سرد مہری، بدتمیزی کا اکثر ان کے ایئرپورٹوں سے گزرتے تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ میں انہیں ایک بے حس، متعصب اور عیاش قوم سمجھتی ہوں مگر حسن عباسی کی یہ کتاب پڑھ کر مجھ پر ان کی کم از کم ایک خوبی ضرور آشکار ہو گئی ہے اور وہ ہے ان کی اپنے وطن سے محبت۔

یہ بات قابلِ تحسین ہے کہ انہوں نے اپنے صحرا میں پھول کھلائے، اسے آباد، سرسبز کیا روشنیوں کا نگر بنایا، جدید دنیا میں ایک تشخص دیا اور آج اسی لیے ساری دنیا دبئی کی سیاحت کو کھنچی چلی جاتی ہے۔ کاش ہمارے پاکستان کو بھی ایسا کوئی ملک سے محبت کرنے والا سورما لیڈر مل جاتا تو ہم بھی یوں جھولی پھیلائے ملک ملک دربدر نہ ہوتے۔ دُبئی کی جدید تعمیر میں ایسے بہت سے غریب پاکستانیوں کا خون پسینہ شامل ہے جنہوں نے اپنی محنتوں کے سودے کیے جن کی ماؤں نے اپنے زیور بیچے اور دلہنوں نے ارمان، تب جا کر کہیں دبئی کی بلند و بالا عمارتیں کھڑی ہوئیں اور ویرانے آباد نظر آئے۔

لیبر کے حوالے سے یہ ایک افسوسناک بات ہے کہ عربی آقا زیادہ تر ہندوستانی ورکرز رکھنا پسند کرتے ہیں، پاکستانی نہیں۔ وجہ جس کی یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ انڈین لوگ زیادہ محنت و جانفشانی سے اپنا کام سرانجام دیتے ہیں، دھوکہ دہی نہیں کرتے، کام میں لارے نہیں لگاتے جبکہ ہمارے پاکستانی بھائی سارے ملک عزیز کے لوگوں کی طرح جھوٹ، دھوکہ بازی، بے ایمانی سے کام کرتے ہیں اور اپنی بے عزتی کرواتے ہیں۔ سننے میں تو یہ بھی آیا ہے کہ ہمارے شیر پنجاب و جناب کی جدہ کی جدید ترین سٹیل ملز میں بھی نوے فیصد ہندوستانی سٹاف رکھا گیا ہے۔ پاکستانی ورکرز کے لیے یہ ایک لمحہ فکریہ سے کم نہیں۔

یہ دُبئی کے شیخ المکتوم خاندان کی نیک نیتی ہی تھی کہ انہوں نے اپنے ملک کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور آج بھی اس کی تعمیر کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ حسن عباسی ابھی ایسے بہت سے سفر کریں گے کہ وہ محبتوں کے سفیر ہیں۔ وہ جہاں کہیں بھی جائیں گے حیرتیں اپنی نیم وا آنکھوں میں سموئیں گے اور بانہوں میں خوبصورتیاں۔ ہر جزیرے پہ ان کے نام کا ایک پھول مہکتا ہوگا جسے کوئی کم لباس خوبصورت جنگلی حسینہ اپنے بالوں میں سجائے، اپنے دہکتے بدن کی خوشبو لیے، ساحلوں سے سیپیاں چنتی ان کی راہ دیکھتی ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ حسن عباسی ایک دن اپنے اس خواب کو ضرور جا لیں گے۔ ان کی شاعری اور نثر مزید نکھرتی چلی جائے گی اور ہم سب ہنسی خوشی ان کی کتابیں پڑھتے رہیں گے۔

حَیَّ عَلَی الْفَلَاح

ابرار ندیم

ایک روشنی کی طرح اندھیرے کو چیرتی اللہ اکبر کی صدا جونہی میرے کانوں میں پڑی میں نماز فجر کی ادائیگی کے لیے بستر سے اُٹھ بیٹھا اور معمول کے مطابق وضو سے فارغ ہو کے مسجد کے لیے نکلنے کو ہی تھا کہ ایک خوشگوار حیرت کی صورت میرے چاروں بیٹے سروں پر ٹوپیاں پہنے مسجد میں میرے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے میرے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ میں نے ایک نظر اپنی بیگم کی طرف دیکھا جو فخریہ انداز میں ان کے پیچھے کھڑی تھی اور دل میں سوچا۔

''یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟''

اور پھر بغیر کچھ کہے سنے مسجد کی طرف چل دیا۔ میرے چاروں بیٹے بھی میرے پیچھے تھے۔

مسجد سے واپسی پر میں ابھی اسی حیرت میں تھا جب چاروں بھائی اپنی ماں کے ساتھ دوبارہ میرے پاس آئے اور سب نے باری باری مجھے یوم پاکستان کی مبارک باد دی۔ ان چاروں میں اتفاق و اتحاد اور فرمانبرداری کا یہ انداز میرے لیے اتنا مسحور کن اور نیا تھا کہ میرے لیے اپنی حیرت اور خوشی پر قابو پانا مشکل ہوگیا۔ میں نے ایک ساتھ ان سب کو مبارک باد کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

''خیریت ہے؟''

جواب میں بڑے بیٹے نے اپنے بھائیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا ''ابا جان! آج یوم پاکستان ہے''

میں نے کہا ''مجھے پتا ہے''

دوبارہ اسی بیٹے نے کہا ''ابا جان ہمیں احساس ہے کہ ہم نے آپ کو اب تک خاصا مایوس کیا ہے۔ ہم اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہیں۔''

میں نے ایک نظر چاروں بیٹوں کو اور پھر ان کی ماں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بیٹوں کی معافی کے لیے ایک خاموش التجا تھی۔

میں اس وقت اپنی عمر عزیز کے 64 ویں سال میں ہوں۔ یہ کوئی ایسی عمر نہیں ہے کہ جس میں بڑھاپے کے بوجھ اور کمزوری سے بندے کی کمر جھک جائے۔ خاص طور پر اس شخص کی جسے اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتوں اور وسائل کے ساتھ چار صحت مند بیٹے بھی دیے ہوں لیکن جس گھر میں پیار، محبت، خلوص، قربانی اور شکر کی جگہ آپس کی نااتفاقی، لڑائی خودغرضی، لالچ اور ناشکرا پن لے لے پھر وہاں دنیا جہان کے دکھ تکلیفیں، بیماریاں اور مایوسی اپنا بسیرا کر لیتے ہیں۔ میری خوش قسمتی نے مجھے اپنا گھر، چار بیٹے، بیوی اور دنیا جہان کی نعمتوں سے نوازا ہے لیکن میرے بچوں کی آپس کی لڑائیوں، نااتفاقی، خودغرضی اور جہالت نے مجھے وقت سے پہلے بوڑھا اور بیمار کر دیا ہے۔ آپس کی لڑائیوں میں یہ اس قدر آگے نکل گئے ہیں کہ ان کو یہ احساس نہیں رہا کہ ان کی بقا آپس کے اتحاد سے وابستہ ہے۔ ان کی لڑائیوں اور ہٹ دھرمیوں کا یہ حال ہے کہ لوگ اب ان کی ہنسی اُڑاتے ہیں۔ وہ عزت، رعب، دبدبہ اور نیک نامی جو میں نے اور میرے بزرگوں نے بڑی محنت اور قربانیوں کے بعد کمائی تھی ان کے بچگانہ رویوں نے اسے خاک میں ملا دیا ہے۔ محلے والے اب ان کی برائے نام بھی عزت نہیں کرتے۔ آپس کی لڑائیوں کے علاوہ اس کا ایک سبب ان کی ادھار کے پیسوں پر عیاشی کی عادت بد بھی ہے۔ ایک دوسرے پر اپنے نظریات کا زبردستی اطلاق اس کے علاوہ ہے۔ ان کو ''راہ راست'' پر لانے کے لیے کیا طریقہ ہوگا جو میں نے اختیار نہیں کیا لیکن یہ چاروں اپنی جھوٹی انا خودغرضی اور جہالت کے خول میں اس بری طرح بند ہیں کہ میں ان کے مستقبل سے مایوس ہو گیا ہوں۔ میں نے وہ خواب جو ان کے سنہری مستقبل کے حوالے سے دیکھے تھے ان کے رویوں کے سبب مٹی ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس فکر نے مجھے مایوس کر دیا ہے جو سو بیماریوں کی ایک وجہ ہے۔

آج یوم پاکستان ہے۔ آج سے 64 برس پہلے ہمارا پیارا وطن پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں ہمارے پرکھوں نے ایک آزاد وطن کا سپنا دیکھا تھا جس میں ہم اپنے اقتدار اور عقیدے کے مطابق امن اور خوشحالی کی زندگی بسر کر سکیں۔

ایک ایسا ہی خواب میں نے اپنے گھر کی بنیادیں رکھتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے ہمیشہ یہ دعا مانگی ہے۔

''اے میرے پروردگار! میرے بیٹوں میں آپس کا پیار محبت اور اتحاد پیدا کر اور انہیں غیروں کی محتاجی اور غلامی کی بجائے عزت و وقار کے ساتھ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھلا دے۔''

آج یوم پاکستان ہے آج ہی کے دن اللہ تعالیٰ نے ایک اور معجزہ کر دکھایا تھا۔ قبولیت کے کسی ایک لمحے نے میرے بیٹوں کی زندگی بدل دی تھی۔ ان کے اندر کے احساس کو زندہ کر دیا تھا۔ ان چاروں کو نا صرف اپنی غلطیوں کا ادراک ہوگیا تھا بلکہ اب وہ اپنی آنکھوں میں ندامت کے آنسو لیے سروں کو جھکائے اپنی غلطیوں کے ازالے کے لیے اک نئے عہد کے ساتھ میرے سامنے کھڑے تھے۔ میری آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔ میرے رب نے میری دعائیں سن لی تھیں۔ صبح کے بھولے شام سے پہلے گھر کو لوٹ آئے تھے۔ میرے چاروں بیٹے اس وقت ایک نئے عزم کے ساتھ میرے سامنے اپنے سینوں پر پاکستانی جھنڈوں کے بیج لگائے کندھے سے کندھا جوڑے میرے خواب کی تعبیر بن کر کھڑے تھے۔

پتا نہیں کتنی دیر تک میں اسی تعبیر کے سحر میں گرفتار آنکھیں بند کیے ہوا تھا کہ اچانک ایک ہنگامے اور شور سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ میرے کمرے کے باہر صحن سے لڑائی جھگڑے کی اُونچی اُونچی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرا خواب ٹوٹ گیا تھا۔ یہ میرے بیٹے تھے جو معمول کے مطابق کسی بات پر آپس میں اُلجھ رہے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ افسوس کے آنسو...... میں سوچ رہا تھا کہ کیا میرا یہ خواب خواب ہی رہے گا؟ میری نظر سامنے دیوار پر گھڑیال کی طرف گئی۔ یہ ظہر کا وقت تھا اور مسجد سے مؤذن کی آواز آ رہی تھی۔

حَیَّ عَلَی الْفَلَاح حَیَّ عَلَی الْفَلَاح

سورج چڑیاں اور ربّ

اجیت کور

اجیت کور بنیادی طور پر پنجابی زبان کی ادیبہ ہیں۔ اب تک ان کے ناول اور کہانیوں کے اُنیس مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ تحقیق و تنقید اور سفرنامے و تراجم پر مشتمل کچھ کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ ہندی اُردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں ان کی اکثر کتابیں شائع ہوئی ہیں اور پانچ کہانیوں پر فلمیں بھی بنائی جا چکی ہیں۔ اجیت کور کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور جہات پر اب تک مختلف یونیورسٹیوں نے ۵۳ طلبہ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگریوں سے سرفراز کیا ہے۔ موصوفہ سرگرم ثقافتی ادارہ اکادمی آف فائن آرٹس اینڈ لٹریچر کی بانی ممبر اور چیئر پرسن ہیں اور ایک دیگر ادبی انجمن فاؤنڈیشن آف سارک رائٹرز اینڈ لٹریچر کی بانی اور صدر بھی۔ "خانہ بدوش" خود نوشت سوانح کے لیے مصنفہ کو ۱۹۸۶ء میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے کئی بڑے قومی اور بین الاقوامی ایوارڈ و اعزازات بھی آپ حاصل کر چکی ہیں۔

میرے دادا بہت سویرے اُٹھتے، منہ اندھیرے، رات کے پچھلے پہر جب اندھیرے میں دُودھیاں روشنی کی ہلکی چھینٹ کھلنے لگتی ہے۔

سردی ہو یا گرمی وہ سدا ٹھنڈے پانی سے نہاتے۔ نہا کر خوش ہوتے رہتے۔ دھیمے سروں میں کچھ گاتے رہتے۔ شاید گروبانی کی کوئی لائن۔

صبح تڑکے نہاتے، پھر وہ پہر کی روٹی کھانے سے پہلے پھر شام کو گردوارے جانے سے پہلے۔

جب بھی خوش ہوتے کھلکھلا کر ہنستے۔ اکیلے بیٹھے ہنستے چلے جاتے۔ نہاتے ہوئے ہنستے، پڑھتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھنے لگتے اور ہنس دیتے۔

صبح سویرے وہ نہا کر سیدھے گرو گرنتھ صاحب کے کمرے میں جاتے، روشنی کرتے اور پھر پاٹھ کرنے لگتے۔ پاٹھ کرتے کرتے آنکھیں بند کر لیتے۔ ان کے ہونٹوں پر ہنسی ہوتی۔ بے آواز ہاتھوں سے جیسے وہ رقص کا انداز بناتے رہتے آنکھیں بند ہونٹوں پر کھلتی ہوئی ہنسی، ہاتھ ناچتے ہوئے اور سامنے گرو گرنتھ صاحب کے کھلے اوراق۔

یہ میرے بچپن کا سب سے عجیب منظر تھا جو پھر میں نے کبھی کہیں بھی نہیں دیکھا۔

آج بھی یاد کرتی ہوں تو حیران ہوتی ہوں۔ کیسے طلسمی دنیا میں رہتے تھے میرے دادا جی۔ ان کے اندر کیسے ایک پوری کائنات آباد تھی۔ انہوں نے خود ہی اس کی تخلیق کی تھی اور اپنے سر جی اس کائنات کی وہ کسی بادشاہ کی طرح نظر ثانی کرتے تھے۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک نگاہ دوڑاتے تھے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک پا کر وہ ہنس دیتے تھے۔

ایک عجیب دُنیا۔

جادو بھری! طلسمی!

کبھی کبھی پاٹھ کرتے ہوئے رُک کر وہ سورج کی طرف دیکھنے لگتے۔ سورج سیدھا گرو گرنتھ صاحب کے کمرے کے باہر چڑھتا تھا۔ آسمان کے تھال میں گھی کے بڑا عظیم سالبہ اُجالا کرتا۔

وہ سورج کو دیکھتے اور ہنسنے لگتے۔ سورج سے باتیں کرنے لگتے، آہستہ آہستہ جیسے کوئی محبوب سے سرگوشیاں کرتا ہے۔

رب سے بھی اسی طرح سرگوشیاں کرتے رہتے۔ دھیمے دھیمے ہنستے ہوئے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہتے جیسے کسی ہمراز دوست سے باتیں کر رہے ہوں۔ ایک اکیلے کمرے میں ایک اکیلے انسان کو اکیلے بیٹھے اس طرح چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے سننا دھیمے دھیمے ہنستے ہوئے دیکھنا عجیب و غریب احساس تھا۔ دوسری دُنیا کو جس کی خبر تب نہیں تھی۔ اب تو بالکل ہی نہیں رہی کیونکہ ہم بڑے ہو کر احساس کی دُنیا سے دُور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ویسے تب بچپن کے اس معصوم بھولے پن میں بھی کبھی دُھندلا احساس ہوتا تھا کہ اس راز کو تو میں سمجھ سکتی ہوں۔ کئی چیزیں سمجھ نہیں بھی آتیں پھر بھی ان کے اندر چھپی ہوئی چیز سمجھ میں آتی ہے۔ دُھندلی سی۔ جسے اس وقت کو لفظوں میں پکڑ پانا ممکن ہوتا ہے۔ بچپن کا یہی تو کرشمہ ہوتا ہے۔ نہیں؟ یہ عجیب و غریب انسان تھے۔ میں ان کو دیکھتی تو حیران ہوتی، چھپ چھپ کر دیکھتی رہتی انہیں۔

گھر میں اور کسی کو ان میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، دادی کو بھی نہیں۔ چاچا جی نے ان دونوں کو گھر کا ایک حصہ رہنے کے لیے دے دیا تھا۔ گرو گرنتھ صاحب کا کمرہ اُوپر چھت پر بنوا دیا تھا۔ کیونکہ دادا جی جنہیں ہم "بھیا جی" کہتے تھے یہی چاہتے تھے۔ بھیا جی کا خود کا ایک کمرہ بھی اُوپر چھت پر ہی تھا۔ گرو گرنتھ صاحب کے کمرے کے ساتھ ملحقہ۔ چاہے دادا دادی جی کا رہنے والا حصہ دوسری چھت پر تھا لیکن دادا جی اپنا زیادہ وقت اپنے چھت والے کمرے میں ہی گزارتے تھے۔ اُوپر کے دونوں کمروں میں سے ایک میں ان کو سدا ڈھونڈا جا سکتا تھا یعنی اگر وہ گھر میں ہوں تو۔

چاچا جی نے انہیں رہنے کے لیے مکان، کھانے کے لیے روٹی، پہننے کے لیے کپڑے اور پاٹھ کرنے کے لیے چھت والے دونوں کمرے دے رکھے تھے۔ ایک پاٹھ کرنے کے لیے اور ایک پاٹھ کے بعد آرام کرنے کے لیے اور جیب خرچ کے لیے الگ سے کافی تھا، نہیں؟ وہ اپنے قرضوں سے چھٹی پا گئے تھے" اور بزرگوں کو ضرورت بھی کیا رہتی ہے" چاچا جی سوچتے ہوں گے۔

میری ماں ان دونوں کو یعنی دادا دادی کو دو وقت کی روٹی پکا کر کھلاتیں۔ صبح اور شام چائے ناشتہ، لسی اور مکھن سب دیتیں۔ بیمار ہوں تو وقت پر دوا کھلاتیں۔ دادی کے سر میں تیل لگا دیتیں۔ وہ سمجھتیں کہ اپنے ساس سسر کی بڑی خدمت کر رہی ہیں۔ "اور بزرگوں کو چاہیے بھی کیا" وہ سوچتی ہوں گی۔

لیکن میں نے دادا جی کو کبھی کسی سے بات کرتے نہیں دیکھا نہ ہی دادی کو۔ بچی بات تو یہ ہے کہ "کیا کھائیں گے؟"، "روٹی کھا لیں"، "لسی؟"، "دودھ؟"، "درزی کو ناپ دے دیں"، "سبزی اور لاؤں" کے علاوہ ان سے اور کوئی بات کرتا ہی نہیں تھا۔ یہ ایک لفظی بات بھی اکثر ماں ہی کیا کرتیں۔

دادی تو اپنے دل کی اندھیری گپھا میں اتر گئی تھیں۔ شاید اور دادا جی نے باتیں کرنے کے لیے دربار صاحب کے کمرے میں رب کو، آسمان میں سورج کو اور چھت کے کھلے آنگن میں چڑیوں کو پا لیا تھا۔ بہت سال پہلے "بھیرا" میں رہتے تھے۔ سرگودھا کا ایک شہر جو اب پاکستان میں ہے، وہاں ان کے دادا پردادا کے وقت کا کوئی پشتینی بیوپار تھا۔ بنی بنائی ساکھ پشتوں سے۔

میرے پردادا کے گھر صرف ایک ہی بچہ پیدا ہوا۔ میرے دادا جی کی ہر نسل میں صرف ایک ہی لڑکا پیدا ہوا کرتا تھا۔ اس خاندان میں جو عام طور پر اکلوتا بچہ ہی ہوتا تھا اور وہ بیوپار، چلا چلایا پشتوں سے جس کی ساکھ نے گہری جڑیں پھیلا رکھی تھیں باپ سے بیٹے تک چلا آتا تھا۔

مگر میرے دادا جی کے گھر دو بچے پیدا ہوئے۔ ایک میرے چاچا جی اور دوسرا ان کا چھوٹا بھائی جس کا نام مجھے معلوم نہیں کیونکہ ان کا نام گھر میں کوئی لیتا ہی نہیں تھا۔

میرے چاچا جی نے کہا وہ تجارت نہیں کریں گے، وہ تو ڈاکٹر بنیں گے، تو وہ امرتسر آ گئے۔ ساتھ میں اپنے چھوٹے بھائی کو بھی لے آئے۔ بولے تو بھی پڑھ اور ڈاکٹر بن۔ پشتینی چلے چلائے بیوپار میں کیا رکھا ہے، نہ کوئی چیلنج نہ اپنی عقل استعمال کرنے کا موقع۔

دونوں بھائی امرتسر میں پڑھتے رہے اور پھر وہیں

میڈیکل کالج میں داخل ہو گئے۔ وہیں پتا جی کے چھوٹے بھائی فوت ہو گئے۔

پتا جی نے جب لاہور میں اپنی پریکٹس شروع کی دادا جی ایک دن اچانک لاہور آ پہنچے۔ دادی ان کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھیں، ان کے ساتھ لوہے کی ایک صندوقچی تھی جس کا رنگ ہرا تھا اور پھول بوٹے نقش تھے۔

لاہور پہنچتے ہی دادی دہاڑ کر پتا جی سے لپٹ گئیں۔

''سب کچھ تباہ کر آئے ہیں یہ۔ سب کچھ لٹا دیا انہوں نے۔ دکان بھی بیچ آئے ہیں۔ گھر کو تالا لگا آئے ہیں۔''

''کیوں، کیسے؟'' پتا جی اتنے حیران تھے کہ انہیں کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا جیسے۔ دادا جی لاپرواہی سے ہنس پڑے۔

''تجھے تو تجارت کرنا نہیں تھا۔ پھر اس سب کو سنبھال کر کرنا بھی کیا تھا۔ مفت کا سر درد۔ جی کا جنجال۔''

دادا جی اور دادی کو ایک بڑا سا کمرہ دے دیا گیا لیکن دادی ہر وقت ان کو گھورتی رہتیں۔ وہ بھیرے کو بھول نہیں پائی تھیں۔ وہاں ان کی جڑیں تھیں جنہیں دادا جی اُکھاڑ کر لاہور لے آئے تھے۔

کچھ دن ہی گزرے ہوں گے کہ دادا جی نے اپنی چارپائی اُوپر چھت کے کمرے میں بچھا لی۔ اس کمرے کے آگے کھلی چھت تھی اور عین سامنے سے سورج اُگتا تھا۔

گروگرنتھ صاحب کا پاٹھ پہلے نیچے ہی ایک کمرے میں ہوا کرتا تھا۔ پتا جی کو دن رات کہہ کہہ کر انہوں نے چھت پر ہی ایک کمرہ بنوا لیا۔ اپنے کمرے کے ساتھ بالکل لگا ہوا، اور گروگرنتھ صاحب کو اسی کمرے میں لے گئے۔ کہنے لگے یہاں کتنی کھلی چھت ہے، کیسی اُجلی دھوپ ہے، کتنی کھلی ہوا ہے۔ بابا جی بھی اُوپر ہی رہیں گے میرے ساتھ والے کمرے میں۔

جب بھی دادی ان کے ساتھ اپنے چھوٹے بیٹے کی بات کر کے بسورنے لگتیں تو ڈانٹ دیتے۔ ''وہ تو اپنا تھا ہی نہیں، غلطی سے آ گیا تھا ہمارے گھر۔ مسافر تھا، چلا گیا۔ تم ہی بتاؤ کبھی ہمارے خاندان میں کسی کے گھر ایک سے زیادہ بیٹا پیدا ہوا ہے اور وہ ایک بیٹا موجود ہے تیرے پاس، دوسرا تو بھولا بھٹکا آ گیا تھا۔ چلا گیا اور اس کے بعد وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اُوپر چلے جاتے۔ چھت پر دربار صاحب کے کمرے میں پاٹھ کرتے اور پھر چپ چاپ آنکھیں بند کر لیتے۔ ہنستے رہتے سرگوشیاں سی کرتے رہتے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں دھیمے دھیمے جیسے کسی معشوق سے کرتا ہے کوئی۔

کبھی وہ آنکھیں بند کر کے ہنستے اور باتیں کرتے۔

کبھی سورج کی طرف دیکھ کر ہنستے اور باتیں کرتے۔

مجھے لگتا ہے ان کی داڑھی کے بال اسی لیے سفید تھے، کیونکہ ان کی سورج سے دوستی تھی، سورج اپنی تمام اُجلی روشنی کے رنگ لیے ان کی داڑھی میں آ بیٹھا تھا۔

میں پوچھتی ''بھیاجی! آپ کس سے باتیں کرتے رہتے ہیں؟'' کہتے ''کسی سے بھی تو نہیں۔'' اور سنجیدہ ہو جاتے۔

انھیں شاید لگتا ہوگا کہ میں بھی اسی گھر کا ایک حصہ ہوں۔ ان کے بیٹے کے گھر کا حصہ جہاں ان کی بات کوئی نہیں سمجھتا سب ہی کہتے تھے ''بھیاجی کا کیا، نہ انہیں کسی کی فکر فاقہ، نہ کسی کی پریشانی نہ کام، نہ دھندا، موج اُڑاتے ہیں موج''

اور تو اور میری دادی بھی یہی کہتی تھیں، کئی بار لڑتیں ان کو کوستیں، انھیں طعنے دیتیں، پرانی باتوں کے طعنے گزرے زمانے کی تلخیوں کے کوسنے وہ سر نیچا کیے سنتے رہتے، کیونکہ دادی کی یہ مہا بھارت کتھا عام طور پر تب ہی شروع ہوتی تھی جب دادا جی روٹی کھا رہے تھے۔ مجھے تو لگتا جیسے دادی انھیں اس طرح اطمینان سے روٹی کھاتے دیکھ کر چڑ جاتی تھیں۔ وہ سنتے رہتے اور جلدی جلدی روٹی کھاتے رہتے تاکہ یہ مشکل وقت جھٹ سے گزر جائے اور وہ وہاں سے کھسک لیں۔

روٹی ختم کر کے وہ اپنی تھالی، کٹوریاں اور لسی کا خالی گلاس جھوٹے برتنوں میں ڈال دیتے۔ چڑیوں کے لیے بچاتی روٹی ہتھیلی میں دبائے جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ جاتے۔ اُوپر کی چھت، چھت پر بنے دونوں کمرے سورج اور چڑیاں، یہی ان کی دنیا تھی جہاں وہ اکیلے نہیں تھے۔ یہی ان کا خاندان بھی یہی ان کا سہارا بھی تھا۔

چڑیوں کے لیے بچائی ہوئی روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتے جاتے اور کھلی چھت پر بکھراتے جاتے۔ چڑیاں ان کے آس پاس بیٹھ کر روٹی کے ٹکڑے چگنے لگتیں، اُڑتیں اور پھر بیٹھ جاتیں۔ بیٹھے بیٹھے پھدکتیں، ان کی ننھی دُموں کے نرم پروں سے لے کر ان کے دھوپ میں چمکتے پروں کے ریشے ریشے میں سے عجیب لرزشیں سی گزرتیں، کپکپاتی ہوئی لہریں سی اور دادا جی ہنستے رہتے چڑیوں سے بھی باتیں کرتے تھے وہ۔ جیسے سرگوشیاں کر رہے ہوں۔ تمام راز کی باتیں۔

مجھے لگتا ہے چڑیوں سے ان کی بہت گہری دوستی تھی۔

تب ہی تو ان کا بدن بھی چڑیوں جیسا ننھا سا اور ہلکا پھلکا تھا۔ بھاگتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ جاتے۔ چھوٹے چھوٹے قدموں پر بھاگتے ہوئے گردوارے چلے جاتے۔ ان کے ساتھ چلو تو دوڑ سی لگانی پڑتی تھی، ان کے کمرے کی شاید ایک صدی سے صفائی نہیں ہوئی تھی۔ یہی کہتے تھے پتا جی کہ پورے سو سال سے پتا جی نے اپنے کمرے کی صفائی نہیں کروائی ویسے ان کو لاہور آئے زیادہ سال نہیں گزر رہے تھے۔

گھر میں جب بھی پتائی رنگ و روغن ہوتا تو پتا جی بہت ناراض ہوتے۔ دادا جی اپنے کمرے میں پتائی والے کو گھسنے ہی نہیں دیتے تھے نہ دروازوں پر رنگ روغن نہ دیواروں پر قلعی۔ جب فرش پر جھاڑو ہی نہیں لگانے دیتے تھے کسی کو تو دیواروں بیچاریوں کی بساط ہی کیا تھی۔

پتا جی ناراض ہوتے ڈانٹتے رہتے۔ دادا جی چپ چاپ سنتے رہتے اور پھر سب کی آنکھ بچا کر اپنے کمرے کو تالا لگاتے اور غائب ہو جاتے۔ گوردوارے چلے جاتے ہوں گے یا لارنس گارڈن یا نہر پر، کون جانے۔

سارا دن غائب رہ کر رات کو گھر لوٹ آتے۔

سارے دن کی اکٹھی ہوئی سورج کی روشنی ان کی داڑھی میں چھپی بیٹھی ہوتی اور کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا۔ مجھ ہی کو وہ نظر آتی تھی۔ یہ میرا اور دادا جی کا مشترکہ راز تھا۔

آتے اور گروگرنتھ صاحب کے کمرے میں جا کر پاٹھ کرنے لگتے۔ پاٹھ کرتے کرتے ہنستے رہتے چھوٹی چھوٹی باتیں جیسے پورے دن کی کتھا کہہ رہے ہوں، کہاں گئے کیا دیکھا کیا کھایا، یا کہاں چھپے رہے سب۔ بتایا نہ میں نے ان کی دوستی رب سے بھی ویسے ہی تھی جیسے سورج سے اور چڑیوں سے۔

میں پوچھتی ''بھیاجی آپ اپنے کمرے کی پتائی کیوں نہیں ہونے دیتے؟ پتا جی بہت غصہ ہو رہے تھے۔'' چپ رہتے وہ۔

لیکن ایک دفعہ صرف ایک بار شاید بہت لاڈ آیا تھا انہیں مجھ پر اور بولے تھے ''آ تجھے دکھاؤں'' اور انہوں نے مجھے اپنے کمرے میں چوہوں کے بل دکھائے۔ چھت کے کونوں میں باریک ریشم کی اوڑھیاں بنتی مکڑیاں۔ کمرے کے روشندان میں کبوتروں کے گھونسلے، پنکھے کے خول میں گوریوں کے گھونسلوں میں چھپے انڈے دکھائے اور دھیمے دھیمے رازدارانہ انداز میں بولے ''تو یہ بیچارے کہاں جائیں گے''

۱۰۳ سال وہ زندہ رہے۔ اسی طرح پوری صدی وہ اپنے ہی دانتوں سے روٹی کھاتے رہے اور چشمہ کے بغیر پنجابی اور اُردو اخبار اور رسالے پڑھتے رہے۔ پاٹھ کرتے رہے۔

مرنے سے پہلے بس دو چار دن بیمار ہوئے نہ دوائی کھائی نہ دودھ پیا۔ کہنے لگے ''بس اپنا اسٹیشن آنے والا ہے، گاڑی سے اُترنے کا وقت آ گیا ہے۔ اب تو بکھرا ہوا سامان سمیٹنا ہے بس۔''

جس دن ان کی موت ہوئی اس دن سورج سویرے اپنے پورے جاہ و جلال سے چڑھا تھا۔ وہ اپنی چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ سورج کی طرف دیکھ کر بولے ''یار! آج تو میں نہایا بھی نہیں'' اور زور سے ہنس پڑے اور پیچھے کی طرف چارپائی پر لڑھک گئے۔ میں زور سے چیخی ''پتا جی بھیاجی کو دیکھو بھیاجی'' پتا جی بھاگے آئے نبض دیکھی پھر ان کو سیدھے لٹا دیا۔ وہ ابھی بھی ہنس رہے تھے اور ان کا منہ سورج کی طرف تھا۔

آپ مانیں گے تو نہیں لیکن سچ کہتی ہوں میں نے خود دیکھا صاف صاف دادا جی سورج سے گلے مل کر ہنس رہے تھے اور سفید داڑھی والا سورج ان کو اپنی چمکتی بانہوں کی آغوش میں لپیٹ رہا تھا۔

کالے کنویں

اجیت کور

اندھیرا تارکول کی طرح گاڑھا اور چپچپا تھا۔ لگتا تھا دو قدموں کے بعد اندھیرا اور بھی بھیانک ہے، زمین اور آسمان کے درمیان پھیلا سیاہ کالا کیچڑ جس میں بس ہم دھنسے رہ جائیں گے۔ ایک بھیانک دلدل ہم کو نگل جائے گی اور ایک چیخ کا چیتھڑا بھی اس سونے پن میں پھڑ پھڑانے کو نہیں بچے گا۔

اس بھیانک سونے پن میں اور کالی اندھیری خاموشی میں ہمارے گڈے کے پہیوں کا ذرّہ ذرّہ زمین سے آسمان تک پھیلتا لگ رہا تھا۔ ویسے آسمان تھا ہی کہاں؟ اندھیرے کا سیاہ کبوتر جو ہمارے سروں سے شروع ہو کر کسی بے نام لامتناہی فاصلے تک پھیلا ہوا تھا۔

وقت؟ وقت کہاں تھا؟ وہ تو اس اندھیری سیاہی کی دلدل میں ہی پھنسا لگتا تھا۔ سورج؟ سورج کو تو کسی نے شاید اندھیری مٹی میں دفنا دیا تھا۔ نہ سورج، نہ روشنی، نہ چاند، نہ تارے، نہ ہوا، نہ کائنات، نہ پیڑ نہ کوئی پرندہ۔ جنگلی جانور وہ تو ضرور ہوں گے ہی، کیونکہ کالے گاڑھے اندھیرے میں کبھی کبھی پیلی خونخوار آنکھیں ہماری طرف گھور کر دیکھتی سی لگتی تھیں اور ایسے وقت میں ہمارے گڈے کے پہیئے کی منحوس کڑکڑ بڑی محفوظ لگتی تھی، ایسا احساس ہوتا تھا شاید پہیئے کے منحوس شور سے ڈر کر ہی وہ جنگلی جانور ہمیں پھاڑ کر کھا جانے میں آنا کانی کر رہے ہوں۔ یہ شور نہ ہوتا تو شاید اب تک ہماری بوٹیاں ان کے پیٹوں میں پہنچ چکی ہوتیں اور ہماری ہڈیوں کو نکیلے آروں کی طرح ان کے دانت چبا رہے ہوتے۔

ہمیں کچھ پتہ نہ تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ بس یہی لگتا تھا کہ گڈا دھیرے دھیرے چل رہا ہے، کس سمت کو اس کا کوئی پتہ نہیں تھا، ہمیں کہاں پہنچنا ہے؟ اس کی خبر ہم میں سے کسی کو نہ تھی، کہ کڑکڑ سن کر ہم سب نے اندھیرے کی دلدل میں سے ہاتھ اُبھارے تھے اور گڈے کی بانہہ کو پکڑ کر اپنے آپ کو بوریوں کی طرح اُچکا کر اس میں پھینک دیا تھا۔ اندھیرے کی دلدل میں دھنسے رہنے سے تو اچھا ہے کہ ہم کسی چلتی ہوئی چیز میں بیٹھ جائیں۔ کھڑے رہنے سے اور آہستہ آہستہ اندھیرے کی قید میں دفن ہو جانے سے تو یہ گڈا محفوظ تھا۔ آخر چل تو رہا ہی تھا، ورنہ پہیوں کا شور کیسے ہوتا اور ہچکولے کیوں آتے۔

لیکن گڈے میں اتنی دیر بیٹھے رہنے سے شک ہونے لگا تھا کہ ہم چل بھی رہے ہیں یا نہیں۔ گڈے کے پہیوں کا یہ شور اور یہ ہچکولے کہیں اندھیرے کا بنا ہوا شک کا جال تو نہیں۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد اندھیرے میں سے ہاتھ گڈے کی بانہہ کو پکڑنے کی کوشش کرتے لیکن ہم گڈے میں اتنے لوگ تھے کہ ہمارے گھٹنے ایک دوسرے کے ساتھ رگڑ کھا رہے تھے۔ ہماری کہنیاں ایک دوسرے سے سٹی ایک دوسرے کو چبھ رہی تھیں اور ہم ایک دوسرے کی سانسوں کی بو اور گرمی محسوس کر رہے تھے۔ اگر اور لوگ گڈے میں چڑھ آئیں تو بیٹھیں گے کہاں ہمارے لیے تو سانس لینے کی جگہ بھی نہیں رہے گی۔

ویسے یہ تھا تو گڈا ہی بہشت کا ٹکڑا نہیں تھا لیکن حضرت نوح کی کشتی کی طرح اندھیرے کے اس سمندر میں سے نکال کر لے جانے کی یہ ہماری واحد اُمید تھی۔ اس لیے جس وقت اندھیرے میں سے نادیدہ ہاتھ ہمارے پاس کے جنگلے کی کھڑکی کو پکڑنے لگتے تو ہم پوری طاقت سے ان اُنگلیوں کی کسی ہوئی مٹھی کھول کر ان ہاتھوں کو اندھیرے کے سیلاب میں واپس دھکیل دیتے۔

کئی ہاتھ ایسے بھی تھے جن کی پکڑ بڑی سخت اور ٹھوس ہوتی۔ لاکھ زور لگانے پر بھی ان کی مٹھی گڈے کی باہی چول سے نہ ہلتی۔ پھر ہم اپنی جیبوں میں سے چاقو نکالتے اور لکڑی کے گرد کسی ان اُنگلیوں کو ایک ہی جھٹکے سے کاٹ دیتے۔ اندھیرے کے سیلاب میں ایک بھیانک چیخ اُبھرتی جیسے آسمان میں اُڑتے عقاب کو گولی لگی ہو اور وہ چیختا ہوا چکراتا ہوا لڑکھڑاتا اپنی ٹوٹی اُڑان اور ٹکڑے ٹکڑے بکھرتے پروں سمیت نیچے زمین کی طرف گر رہا ہو۔

لیکن یہاں سیاہ کالے اندھیرے میں نہ انسان نظر آ رہا تھا نہ ٹوٹی اُڑان والا عقاب صرف ایک لمبی خوفناک درندے کی چیخ اندھیرے کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک تیز خنجر کی طرح کاٹتی چلی جاتی تھی اور ہمارے ہاتھوں میں کئی اُنگلیوں کے ٹکڑے رہ جاتے تھے جن کی چپچپاہٹ سے ہم اندازہ لگا لیتے تھے کہ شاید ان میں سے خون ہی رِس رہا ہوگا۔

ویسے اس اندھیرے میں نہ گوشت کا گندمی رنگ تھا نہ خون کا سرخ رنگ سب کچھ کالا تھا۔ کالا اور چپچپا۔

اچانک گڈے میں سے ایک بچے کے آہستہ آہستہ سبکنے کی آواز آنے لگی تو کیا اس گڈے میں کوئی بچہ بھی تھا؟

یہ کیسا اندھیرا تھا جس میں نہ حیرانی نہ ہمدردی۔ نہ اپنی طرح کے اور لوگوں کے ہم سفر ہونے کی یقین دہانی تھی نہ تنہائی کی بوکھلاہٹ نہ غم نہ اُداسی نہ ہی کوئی بول رہا تھا۔ ہم سب کے گلے میں اندھیرے اور خوف کی چپچپاہٹ تھی بس۔

بچہ رہ رہ کر مسکرا اُٹھتا تھا۔ ہچکی کا ایک ٹوٹا ہوا ٹکڑا ایک خوفزدہ سرگوشی۔ اس کی ماں اسے چپ کیوں نہیں کرواتی، اسے بہلاتی کیوں نہیں، ماں اس کی ماں اس گڈے میں ہے بھی کہ نہیں کون جانے۔

اندھیرا...... گڈے کے پہیوں کی مسلسل گڑگڑاہٹ جیسے کوئی موت کی آخری ہچکی سے پہلے کراہ رہا ہو۔

اچانک مجھے لگا کہ میرے کندھے کو کسی ننھی سی ہتھیلی نے پکڑا ہو، سہارے کے لیے میرے گال پر اس کے سبکنے کے لمس کا احساس ہوا۔ پھر دو چھوٹی چھوٹی ٹانگیں میری ٹانگوں سے رگڑتی ہوئی لڑکھڑاتی سی گزرنے لگیں۔ لگا کہ کوئی بچہ گڈے میں ادھر سے اُدھر چل رہا ہے، سبکتا لڑکھڑاتا، لوگوں کی سکڑی سمٹی ٹانگوں بانہوں میں سے اور اندھیرے میں جمے جسموں میں سے راہ بناتا۔ ٹٹول ٹٹول کر لوگوں کے کندھے ڈھونڈتا اگلا قدم اُٹھانے کے لیے سہارا لیتا۔

شاید اپنی ماں کو تلاش کر رہا ہوگا میں نے سوچا۔

اچانک دور اندھیرے میں کچھ آنکھیں چمکیں اس طرف جدھر ہمارا گڈا لڑھکتا ہوا جا رہا تھا، عجیب تھی وہ آنکھیں اندھیرے میں برمی سے سوراخ کرتی پیلی وحشی روشنی سے جلتی بجھتی روشنی بھی کاہے کی جیسے کوئی ادھ مرے جگنو ہوں۔

میں نے اس پیلی ادھ مری روشنی میں اپنے ساتھیوں کی قد و قامت تلاش کرنے کی کوشش کی۔

ماں......آں......آں

کسی بچہ کی لمبی چیخ...... ماں، آں، آں۔ ایک التجا کرتی ہوئی پکار، اندھیرے کی تھاہ میں زخمی پرندے کی طرح تڑپتی ہوئی پھٹے چیتھڑے کی طرح بونڈر میں پھڑ پھڑاتی۔ اندھیرے کی دلدل میں خنجر چبھوتی۔

بچہ چیخ رہا تھا۔ زور زور سے چیخ کر رو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نہیں ہیں، اس کی آنکھیں نہیں ہیں۔

''کس کی آنکھیں؟'' اندھیرے میں کسی نے پوچھا۔

''وہ جو گڈا چلا رہا ہے اس کی آنکھیں نہیں ہیں۔ صرف گڑھے، ماتھے کے نیچے دو گڑھے ہیں۔'' بچہ دہشت میں چیختا ہوا بول رہا تھا، بلکورے لے لے کر عجب خوف کے شکنجہ میں جڑی ہوئی اس کی آواز۔ اندھیرے کی سیاہی کو کھروچتی ہوئی اس کی چیخ سنائی دی۔ اس کی آنکھیں نہیں ہیں۔ ماتھے کے نیچے دو گڑھے۔ ہڈیوں میں کھدے ہوئے دو گڑھے اتنے گہرے، کنوؤں جیسے، کالے کنوئیں، آنکھیں نہیں کالے کنوئیں۔

گبریلا مسترال اور پابلو نرودا کی شاعری

تعارف و ترجمہ: عامر بن علی

پچھلی ایک صدی میں اس کرۂ ارض پر اس کتاب میں شامل نظموں جیسی بہت کم نظمیں کہی گئی ہیں۔ "محبت کے دو رنگ۔ گبریلا مسترال اور پابلو نرودا" میں ایک رنگ عورت کی محبت کا ہے تو دوسرا مرد کی محبت کا۔ گبریلا مسترال اور پابلو نرودا کی زندگی میں کئی چیزیں مشترک ہیں جیسے دونوں کا تعلق جنوبی امریکہ کے ملک چلی سے ہے دونوں ادب کے نوبل انعام یافتہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ کامیاب سفارتکار بھی تھے۔ گو کہ دونوں کا نظریہ سیاست کے متعلق بہت حد تک متضاد تھا۔ پابلو نرودا کیمونسٹ پارٹی کے نہ صرف سربراہ رہے بلکہ پارٹی کی طرف سے ملک کے صدر کے عہدے کے لئے امیدوار بھی منتخب ہوئے جبکہ گبریلا مسترال سیاست سے دور رہنا پسند کرتی تھی۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب اٹلی کے مطلق العنان حکمران مسولینی نے اسے وزارت کی پیشکش کی تو اس نے اسے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ تاہم مسترال اور نرودا کی شاعری میں محبت کا رنگ الگ الگ ہونے کے باوجود ایک چیز مشترک ہے کہ دونوں کے رنگ سچے اور سُچے ہیں۔ مجھے لگتا ہے بلھے شاہ نے انہی کے لئے کہا تھا۔ " جو رنگ رنگیا گوڑھا رنگیا" اسی لئے میں اس کتاب کا نام بھی بلھے شاہ سے ہی مستعار لے رہا ہوں۔ میں پابلو نرودا اور گبریلا مسترال کی پہلی ملاقات ہوئی جب چلی کے شہر تیموکو میں نرودا ہائی سکول کا طالب علم تھا اور مسترال اس سکول میں ایک سال سے زیادہ عرصہ پڑھاتی رہی۔ اس لحاظ سے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دونوں کا نہ صرف عہد ایک تھا بلکہ استاد اور شاگرد والا خوبصورت ذاتی نوعیت کا باہمی تعلق بھی موجود تھا۔

گبریلا مسترال کی شاعری کا اردو زبان میں یہ پہلا ترجمہ ہے اور پابلو نرودا کی نظموں کا بھی اس لحاظ سے پہلا ترجمہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے پہلے ترجمہ ہونے والی نظمیں انگریزی ترجمے سے ترجمہ کی گئی ہیں اور تعداد میں بھی بہت قلیل ہیں جبکہ اس کتاب میں میں نے ہسپانوی زبان میں ان شعراء کے اصل متن سے ترجمہ کیا ہے۔ ویسے تو شاعری کا ترجمہ جتنا بھی خوبصورت ہو اس میں اصل زبان والی چاشنی اور موسیقیت نہیں ہو سکتی مگر جب ترجمے کو ترجمہ کیا جائے پھر تو رہی سہی کسر بھی نکل جاتی ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی خوبصورت منظر کی تصویرکشی کی جائے اور پھر اس تصویر سے تصویر بنائی جائے اس کے باوجود پابلو نرودا کی شاعری کے تراجم کرنے والے لوگ قابلِ قدر ہیں کہ انہوں نے اس عظیم شاعر کی شاعری کا کم از کم مرکزی خیال تو اردو قارئین تک پہنچانے کی قابل ستائش کوشش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی بھی زبان کی شاعری کا ترجمہ کرنے والے شخص کا خود شاعر ہونا ضروری ہے کیونکہ شعر کی موسیقیت کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا تبھی ممکن ہے جب شعریت کا ادراک ہو۔ اور طبیعت میں موزونیت کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے میں ہمارے شاعر دوست جاوید شاہین مرحوم کے تراجم سب سے بہتر ہیں مگر انہوں نے بھی پابلو نرودا کی صرف چھ نظموں کا ترجمہ کیا تھا اور وہ بھی انگریزی متن سے۔

گبریلا مسترال 1889 میں پیدا ہوئی تو اس کے والدین نے اسے جو نام دیا وہ لوسیا دی ماریا تھا۔ لاطینی امریکہ کی یہ پہلی شخصیت جسے 1945 میں ادب کا نوبل انعام ملا، اسکے قلمی نام کی کہانی بھی اس کی شخصیت کی طرح دلچسپ ہے۔ پچیس سال کی عمر میں اس نے اپنے دو پسندیدہ شاعروں کے نام گبریل دی انتیسو (Gabriele De Anunczio) اور فریڈرک مسترال (Frederic Mistral) سے اپنا قلمی نام گبریلا مسترال اخذ کیا۔ نام کی تبدیلی یا قلمی نام رکھنا اہل قلم میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ مگر مسترال کے واقعے میں اس کی اہمیت اس لئے بنتی ہے کہ 1909 میں اس کا عاشق جو ریلوے کا ملازم تھا اور عمر میں اس سے بڑا تھا، خودکشی کر کے اسے داغ مفارقت دے گیا۔ مورخین کا خیال ہے کہ گبریلا مسترال کے نام کی تبدیلی کی وجہ یہی واقعہ بنا کیونکہ خودکشی کرنے والے رومیلیو اوریتا کو وہ اپنی پہلی محبت قرار دیتی ہے۔ اس کی شاعری میں ہمیں جہاں بنیادی طور پر محبت، بے وفائی، قدرتی مناظر، غم، ماں کی محبت اور سفر کے مضامین ملتے ہیں وہیں اسکے محبوب کی خودکشی کا واقعہ بھی جا بجا اثر انداز ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ تعلیم مکمل کئے بغیر گبریلا مسترال نے تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا۔ تدریس کا شعبہ اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کا باپ اور بہن بھی چونکہ سکول میں بچوں کو پڑھاتے تھے اس لئے پڑھانا اس کے گھر کی روایت بھی تھی۔ اس نے چھوٹی عمر میں ہی بڑے بڑے غم اٹھائے بچپن میں ایک یہ بھی تھا کہ وہ تین برس کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اسکے والد کا انتقال ہو گیا اور اس کی پرورش بڑی بہن کے ہاتھوں ہوئی مگر جلد ہی وہ بھی ساتھ چھوڑ گئی۔ ابتدائی زندگی کے ایام شدید کسمپرسی کے تھے۔ افلاس سے مسترال کیسے نبرد آزما تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگا لیجئے کہ وہ صرف پندرہ سال کی تھی جب وہ نہ صرف اپنا بوجھ اٹھا رہی تھی بلکہ اپنی بیمار ماں کی دیکھ بھال بھی کر رہی تھی اور گھر کی واحد کفیل تھی۔ مالی پریشانیوں کے سبب ہی اس نے تعلیم بھی ادھوری چھوڑ دی تھی مگر اس کی بڑی بہن نے اسے اسسٹنٹ ٹیچر کی نوکری کوشش کر کے دلوا دی تھی۔

ویسے بھی بیسویں صدی کی پہلی اور دوسری دہائی کے دوران چلی میں تربیت یافتہ اور تجربہ کار اساتذہ کی شدید کمی تھی اور مضافاتی علاقوں میں تو اساتذہ کی یہ کمی شدید تر تھی۔ اس لئے جو کوئی بھی پڑھانے کے لئے نوکری تلاش کرتا، اسکی تعلیمی قابلیت اور تجربے کی کمی اس کے لئے رکاوٹ نہ بنتی تھی اور اسے کسی نہ کسی سکول میں نوکری مل ہی جاتی تھی۔ فنکاروں میں بالعموم اور شاعروں کی طبیعت میں بالخصوص جو بے چینی پائی جاتی ہے وہ بے چینی مسترال میں بھی موجود تھی جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ 1906 سے لیکر 1912 تک کے عرصے میں اس نے تین مختلف شہروں میں رہائش اختیار کی گو کہ وہاں بھی پڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ لاسرینا، آنتافوگستا اور لاس آندیس میں قیام کے دوران سنتیاگو بھی وہ مسلسل آتی جاتی رہتی تھی

1918 میں اسے "پونتا ارینا" کے ایک سکول کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا اور 1920 میں وہ تیموکو کے سکول میں پڑھانے لگی جہاں اسکی پابلو نرودا سے پہلی ملاقات بھی ہوئی۔ اگلے سال اسے سنتیاگو کے ایک سکول کا سربراہ مقرر کرنے پر ایک تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ اعلیٰ طبقے کی لڑکیوں کے اس سکول میں تعیناتی کا تنازعہ بڑھتا ہی چلا گیا تو مسترال نے دل برداشتہ ہو کر 1922 میں میکسیکو کی وزارت تعلیم کی طرف سے ماہر تعلیم کے عہدے کی پیشکش قبول کر لی اور چلی کو خیرباد کہہ دیا۔ اسی سال نیویارک سے اسکی کتاب "تنہائی" شائع ہوئی جس نے گبریلا مسترال کا عالمی سطح پر زیادہ موثر انداز میں تعارف کروا دیا۔

شاعری کے میدان میں اسے پہلی بڑی کامیابی 1914 میں ملی جب چلی کے قومی ادب ایوارڈ سے اسے نوازا گیا۔ یوں تو پندرہ سال کی عمر میں ہی اس نے کئی یادرہنے والی نظمیں تخلیق کر دی تھیں اور وہ شائع ہو کر سند قبول بھی حاصل کر چکی تھیں مگر اتنی چھوٹی عمر میں "مردے کی ہڈیاں" کے نام سے مجموعہ کلام کی اشاعت پر ملک کا سب سے بڑا ادبی اعزاز حاصل کر لینا اس کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کی دلیل ہے۔ یاد رہے کہ میکسیکو میں قیام کے دوران اس کا امریکہ بھی کافی آنا جانا رہا اور واشنگٹن میں اس نے پین امریکن یونین سے بھی خطاب کیا۔ یورپ بھی اس کی محبوب منزل تھا، اور سپین سے اس کو خصوصی لگاؤ تھا شاید اسی سبب سے اگلے شعری مجموعے کی اشاعت بھی سپین میں ہی ہوئی۔ 1925 میں وہ چلی واپس لوٹ آئی اور تدریس کے شعبے سے اس نے ریٹائرمنٹ اختیار کر لی۔ گو کہ مسترال بارہ برس کی بھی نہیں تھی جب اس نے روایتی تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا مگر وطن واپسی پر یونیورسٹی آف چلی نے اسے اعزازی پروفیسر کے عہدے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا۔ اسی سال لیگ آف نیشنز نے اسے خطاب کی دعوت دی جسے اس نے قبول بھی کیا۔ 1926 میں وہ فرانس منتقل ہو گئی اور پھر باقی زندگی اس نے خود ساختہ جلاوطنی میں ہی گزاری۔ اس دوران اس کا اٹلی میں بھی قیام رہا جہاں مسولینی حکمران تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ مسولینی نے اسے وزارت کی پیشکش کی تھی جسے اس نے ٹھکرا دیا تھا۔ اس سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ فسطائیت کے خلاف تھی مگر وہ کیمونسٹ بہرحال نہیں تھی۔ مسترال کی زندگی ہمیں سیاست سے کتراتی نظر آتی ہے۔ اس کی خود ساختہ جلاوطنی کی وجہ شاعرانہ بے چینی والا لاابالی پن کے علاوہ سیاست سے دور رہنے کی خواہش بھی ہو سکتی ہے۔ باوصف اس کے کہ وہ ایک دردمند دل رکھتی تھی اپنی کتاب "TALA" کی تمام کمائی اس نے سپین کی خانہ جنگی میں یتیم ہونے والے بچوں کے نام کر دی تھی۔ بچوں سے اسے خصوصی محبت تھی جس کا اظہار اس کے اپنے الفاظ میں ہوتا ہے "اُس کا نام آج ہے، ہم بہت سی غلطیوں اور خرابیوں کے ذمے دار ہیں مگر ہمارا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ ہم نے بچوں کو نظرانداز کر رکھا ہے، زندگی کے چشمے کو بھلا رکھا ہے۔ بہت سی چیزیں جن کی ہمیں ضرورت ہے، انتظار کر سکتی ہیں۔ مگر بچے انتظار نہیں کر سکتے ہیں۔ یہی وقت ہے جب اس کی ہڈیاں بن رہی ہوتی ہیں، اس کا خون بن رہا ہوتا ہے اور اس کے حواس خمسہ تشکیل پا رہے ہوتے ہیں۔ اس کو ہم یہ جواب نہیں دے سکتے کہ " کل" کیونکہ اس کا نام " آج " ہے۔ اپنی عمر کا آخری حصہ اس نے امریکہ میں گزارا۔ 1957 میں جب وہ دنیا سے رخصت ہوئی تو اس کی عمر 67 برس تھی۔

گبریلا مسترال آزادی اور تہذیب کا حصول تعلیم اور خدمت کے ذریعے ہی ممکن سمجھتی تھی اور اسی مقصد کے لئے اس نے شاعری کے ساتھ ساتھ زندگی بھر آزادی اور تہذیب کی ترویج کے لئے تعلیم دینے اور خدمت کے کام کرنے کو ایک روحانی فریضہ سمجھا اور ہمیشہ یہی سمجھا کہ دوسرا راستہ حیوانیت اور جنگل کی طرف واپس لے جاتا ہے۔

چلی میں پابلو نرودا اور گبریلا مسترال کے چاہنے والے عام زندگی میں عموماً متضاد قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ سیدھی بات کروں تو نرودا کا حلقہ اثر زیادہ تر سوشلسٹ، بائیں بازو یا پھر ترقی پسند سوچ رکھنے والے لوگوں پر مشتمل ہے جبکہ مسترال روایتی اشرافیہ، سرمایہ دارانہ نظام اور مغربی جمہوریت کے حامی لوگوں میں زیادہ مقبول ہیں۔ لاطینی امریکہ میں اگر آپ کسی پڑھے لکھے شخص کے سیاسی نظریات جاننا چاہیں اور براہ راست سیاست پر سوال بھی نہ کرنا چاہتے ہوں تو اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ صرف یہ پوچھ لیجئے کہ اس شخص کو گبریلا مسترال اور پابلو نرودا میں سے کون سا شاعر زیادہ پسند ہے؟ اگر جواباً نرودا کا نام آئے تو سمجھ لیجئے کہ یہ شخص ترقی پسند ہے اور مسترال کو پسند کرنے والا آدمی امید ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کا حامی ہو گا یا کم از کم سوشلسٹ تو ہرگز نہیں ہو گا۔

پابلو نرودا کی پیدائش 1904 میں چلی کے جنوب میں واقع ایک چھوٹے سے شہر پارال میں ہوئی۔ اس کی عمر فقط دو ماہ تھی کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا جس کے بعد اس کے والد نے دوسری شادی کر لی جس میں سے اس کا ایک سوتیلا بھائی اور ایک بہن پیدا ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اس نے اپنے آبائی شہر میں ہی حاصل کی اور مزید تعلیم کے حصول کے لئے وہ سنتیاگو منتقل ہو گیا۔ وہ صرف دس سال کا تھا جب اس کی پہلی نظم شائع ہوئی اور اپنی عمر کے بیس سال مکمل کرنے سے پہلے وہ عالمی سطح پر ایک مقبول شاعر بن چکا تھا۔ نرودا کے والد نے ہمیشہ اس کے لکھنے کے کام کی مخالفت کی اور اسے نصابی پڑھائی پر توجہ دینے کے لئے کہتا رہا مگر کئی دوسرے لوگوں نے اس کی حوصلہ افزائی بھی کی جن میں گبریلا مسترال بھی شامل تھی۔ سولہ برس کی عمر میں جب اس نے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا تو اس کا ایک مقصد اپنے والد کو غچہ دینا بھی تھا۔ یاد رہے کہ نرودا کا اصل نام نیفتالی باسو آلتو تھا۔ انیس برس کی عمر میں اس کا پہلا شعری مجموعہ شائع ہو گیا تھا اور وہ تب بیس برس کا تھا جب اس کی نظموں کا عہد ساز مجموعہ "محبت کی بیس نظمیں" اشاعت پذیر ہوا، جو کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور لاکھوں کی تعداد میں اس کی کاپیاں فروخت ہوئیں۔ مگر غربت نے اس کا ابھی تک پیچھا نہ چھوڑا تھا حالانکہ وہ عالمی سطح پر مانا ہوا شاعر اور ادیب بن چکا تھا۔ معاشی مجبوریوں کی وجہ سے ہی اس نے بحیثیت سفارتکار نوکری اختیار کر لی اور رنگون، کولمبو اور جاوا کے علاوہ سنگاپور متعین رہا۔ اسی دوران اس نے ایک جرمن خاتون سے شادی کر لی جو بنک میں ملازمت کرتی تھی۔

1971 میں ادب کا نوبیل انعام پانے والے نرودا کے متعلق کولمبیا کے معروف صحافی اور ناول نگار گارشیا مارکیز جو کہ خود بھی نوبیل انعام یافتہ تھا کہا کرتا تھا کہ "بیسویں صدی کا کسی بھی زبان میں وہ سب سے بڑا شاعر تھا"، یہاں مسترال اور نرودا کی شخصیت کا ایک اور مشترک پہلو قارئین کی دلچسپی کا باعث ہو گا کہ مسترال کی طرح نرودا نے بھی اپنا قلمی نام اپنے پسندیدہ شاعر کے نام سے اخذ کیا تھا۔ چیک ریپبلک سے تعلق رکھنے والے شاعر جان نرودا سے وہ اتنا متاثر تھا کہ اپنے یورپ کے

دورے کے دوران وہ خصوصی طور پر چیکوسلواکیہ گیا تھا تاکہ اس شاعر کی قبر پر پھول چڑھا سکے۔ یہ ایک الگ یادگار داستان ہے مگر اس کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

ایشیائی ممالک میں سفارتکاری سرانجام دے کر وہ واپس چلی لوٹا تو اسے پہلے بیونس آئرس اور پھر بارسلونا میں سفارتی عہدوں پر تعینات کیا گیا۔ بعدازاں وہ گبریلا مسترال کی جگہ میڈرڈ میں چلی کا قونصلیٹ مقرر ہوا۔ اس کی بیٹی مالوا مرینا کی پیدائش 1934 میں میڈرڈ میں ہی ہوئی جو اپنی مختصری آٹھ سالہ زندگی میں اکثر بیمار ہی رہی۔ اسی دوران سپین میں خانہ جنگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہاں اس کا حلقۂ احباب زیادہ تر ترقی پسند سوچ کے حامل دانشوروں اور مصنفین پر مشتمل تھا۔ نرودا کے کمیونسٹ خیالات انہی دنوں ترتیب پائے اور جب سپین کے آمر جنرل فرانکو نے اس کے ادیب دوست گارسیا لورکا کو قتل کروا دیا تو اس کے نظریات کمیونزم کے متعلق مزید پختہ ہونے کے ساتھ ساتھ شدت اختیار کر گئے اور وہ کھل کر جنرل فرانکو کے خلاف سوشلسٹوں کی حمایت کرنے لگا جس پر اسے نوکری سے برخاست کر دیا گیا۔ انہی دنوں اس کی جرمن بیوی بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ 1938 میں مگر سپین میں اس کے دوست الیکشن جیت کر برسر اقتدار آ گئے اور اسے فرانس میں ہسپانوی مہاجرین کا مشیر مقرر کر دیا گیا جس عہدے کے متعلق نرودا کا کہنا تھا کہ "میری زندگی میں یہ سب سے مقدس مشن تھا جسے میں نے قبول کیا"

1940-1943 میں وہ میکسیکو میں چلی کا سفیر تعینات رہا۔ یہاں اس کی دوسری شادی ہوئی اور اپنی بیٹی کی موت کی اطلاع بھی اسے یہیں موصول ہوئی۔ اسی دوران اسٹالن حکومت کے مخالف لیون ٹراٹسکی پر قاتلانہ حملہ ہوا جو ان دنوں میکسیکو میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ نرودا پر الزام ہے کہ وہ اسٹالن حکومت کا حامی تھا اور اس نے ٹراٹسکی پر قاتلانہ حملہ کرنے والوں کو نہ صرف پناہ دی تھی بلکہ ان کو چلی کے ویزے جاری کر کے ملک سے فرار بھی کروایا تھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جنگ عظیم دوم میں نازی جرمنی کی شکست میں اسٹالن کے کردار کی وجہ سے پابلو نرودا اس کا مداح تھا۔ 1953 میں نرودا کو اسٹالن امن انعام سے بھی نوازا گیا اور اسٹالن کی موت پر اس نے اسٹالن کے لئے ایک طویل مرثیہ لکھا تھا مگر ٹراٹسکی پر حملے میں ملوث ہونے کے الزام کی نرودا نے ہمیشہ تردید کی۔ ویزوں کے اجراء کے متعلق اس کا کہنا تھا کہ ایسا میکسیکو کے صدر کے کہنے پر کیا گیا تھا۔ یہاں پر یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ پابلو نرودا کی کردارکشی کے لئے امریکی سی آئی اے نے باقاعدہ ایک سیل قائم کیا تھا اور یہ کوئی افواہ یا پراپیگنڈا نہیں بلکہ اب امریکی حکومت سرکاری طور پر بھی اس خصوصی سیل کے وجود کی تصدیق کرتی ہے اس لئے ممکن ہے کہ نرودا کے اوپر عائد یہ الزام اور اس طرح کے کئی دوسرے الزامات حقیقت میں امریکی سی آئی اے کے تراشے ہوئے افسانے ہی ہوں۔ بالشویک انقلاب روس کے ہیرو ٹراٹسکی کی آپ بیتی جس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے اس میں بھی کہیں نرودا کے کسی ایسے فعل میں ملوث ہونے کا کوئی اشارہ نہیں ملتا ہے۔

1945 میں وہ سینیٹر منتخب ہوا اور اس کے بعد اس نے باقاعدہ طور پر کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ وہ آنتافوگاستا سے پہلے سینیٹر منتخب ہوا اور کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اس کے بعد اختیار کی۔ یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ چلی میں سینیٹر براہ راست عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوتے ہیں، پاکستان کی طرح بالواسطہ انتخاب کی بجائے سینیٹرز کا انتخاب امریکی طرز پر ہوتا ہے جس میں انتخابی حلقوں کی بنیاد پر حلقے کے لوگ انہیں منتخب کرتے ہیں۔

اسی سال وہ پیرو کے دورے پر بھی گیا جہاں اس نے لازوال نظم "ماچوپیچو کی بلندیاں" تحریر کی۔ یہ نظم انتہائی طویل ہے جس کے بارہ حصے ہیں جن میں سے آخری حصہ ترجمہ کر کے اس کتاب میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ میساچوسٹس یونیورسٹی امریکہ میں شعبہ تخلیقی آرٹ کے سربراہ پروفیسر مارٹن کا کہنا تھا کہ "ماچوپیچو کی بلندیاں" انسانی تاریخ میں سب سے بڑی سیاسی نظم ہے۔

1946 میں نرودا کو صدارت کے لئے کمیونسٹ امیدوار کی سیاسی مہم کا انچارج مقرر کر دیا گیا۔ 1948 میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئی اور اس نے روپوشی اختیار کر لی۔ روپوشی کے دوران وہ تیرہ ماہ تک مختلف شہروں میں اپنے دوستوں کے گھروں اور تہہ خانوں میں چھپتا رہا کیونکہ حکومت کے کارندے اسے گرفتار کرنے کے لئے جگہ جگہ چھاپے مار رہے تھے۔ ایک سال سے زائد عرصہ کی یہ روپوشی اس طرح ختم ہوئی کہ وہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر ارجنٹائن فرار ہو گیا۔ یہ سارا واقعہ نرودا نے نوبل انعام وصول کرتے وقت اپنی نوبل تقریر میں دہرایا تھا۔ اگلے تین سال اس نے جلاوطنی میں گزارے۔

ارجنٹائن میں وہ اپنے ہم شکل ناول نگار دوست میگل، جسے بعدازاں ادب کا نوبل انعام بھی ملا، اس کے پاسپورٹ پر پورا یورپ گھومتا رہا۔ اسی دوران اس نے چین، ہندوستان، روس اور سری لنکا کے دورے بھی کئے۔ میکسیکو میں قیام کے دوران اس کو وہاں کی حکومت نے شہریت دے دی۔ اس کے بعد 1952 میں وہ اٹلی کے جزیرے کیپری میں اپنے ایک مورخ دوست کے ہاں رہائش پذیر رہا۔ نرودا کا یہ مختصر قیام بہت یادگار رہا جس پر 1965 میں ناول بھی لکھا گیا اور اس ناول پر بعدازاں 1994 میں فلم بنائی گئی۔ "IL POSTINO" کے نام سے بننے والی یہ فلم جسے انگریزی میں "The Post Man" کے نام سے ڈب کیا گیا ہے، ہمیشہ یاد رکھی جانے والی فلموں میں سے ایک ہے۔ 1953 میں وہ واپس وطن پہنچا اور پھر اپنی موت تک زیادہ عرصہ وہیں قیام پذیر رہا۔ اس میں سے صرف وہی عرصہ اس نے ملک سے باہر گزارا جب 1970-1973 میں اسے پیرس میں سفیر مقرر کیا گیا۔ 1969 میں اسے کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے ملک کی صدارت کا امیدوار منتخب کیا گیا مگر وہ اپنے دیرینہ دوست سالوادور آئندے کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ فرانس میں سفیر کا عہدہ بھی اس نے آئندے کے کہنے پر قبول کیا تھا، جو انتخابات میں کامیاب ہو کر چلی کا صدر بن چکا تھا۔ مگر وہ زیادہ عرصہ اس عہدے پر براجمان نہ رہ سکا۔ امریکی سی آئی اے نے چلی کے فوجی جرنیلوں کے ساتھ مل کر 1973 میں منتخب حکومت کا تختہ الٹ دیا تاکہ کمیونزم کا راستہ روکا جا سکے۔ اس آپریشن میں امریکی لڑاکا طیاروں اور اس کے فوجیوں نے باقاعدہ طور پر حصہ لیا تھا۔ جنرل پنوشے نے فوجی بغاوت کی قیادت کی جس دوران منتخب صدر آئندے کو گولیاں مار کر قتل کر کے نامعلوم مقام پر دفن کر دیا گیا۔ یاد رہے کہ یہ سرد جنگ کے عروج کا زمانہ تھا اور امریکہ ان دنوں دائیں بازو کے حامی ہر فوجی آمر کا کھل کر ساتھ دے رہا تھا۔ 11 ستمبر 1973 کو جب

مارشل لاء نافذ کیا گیا تو اس سے صرف تین دن پہلے پابلو نرودا کینسر کے علاج کی غرض سے ہسپتال میں داخل ہوا تھا۔ فوجی بغاوت کے دس دن بعد مشکوک حالات میں اس کا انتقال ہوگیا۔ سرکاری طور پر کہا گیا کہ اسے ہارٹ اٹیک ہوا ہے مگر لوگوں کی اکثریت کا ماننا ہے کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔ ویسے بھی وہ کینسر کے مرض کے علاج کے لئے ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا مگر اس کے انتقال کی وجہ ہارٹ اٹیک بتائی گئی جو کہ غیر منطقی سی بات لگتی ہے۔

2011 میں چلی کی ایک عدالت نے پابلو نرودا کی موت کا سبب جاننے کے لئے ایک تحقیقاتی کمیشن تشکیل دیا تھا جس کی تحقیقات ابھی تک جاری ہیں۔ جنرل پنوچے نے اس کے جنازے کو عوامی اجتماع میں تبدیل ہونے پر پابندی لگا دی تھی۔ شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا مگر ملک کے طول وعرض سے ہزاروں افراد نے کرفیو کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سنتیاگو کی گلیوں اور بازاروں کو کھچا کھچ بھر دیا تھا۔ اپنی موت سے صرف ایک مہینہ قبل اس نے اپنی یادداشتیں مکمل کی تھیں جسے اس کی بیوی متلدے چھپا کر ملک سے باہر لے جانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ یہ یادداشتیں دنیا کی کئی زبانوں میں بشمول اردو ترجمہ ہوکر شائع ہو چکی ہیں۔ نرودا کو اس کے ازلا نیگرا میں ساحل پر واقع گھر کے باہر دفن کیا گیا اور اس کی بیوی متلدے بھی اس کے ساتھ ہی مدفون ہے۔ اس کا یہ گھر بھی باقی دو گھروں کی طرح اب میوزیم میں تبدیل کیا جا چکا ہے۔

ان شعراء سے میرا تعارف چلی میں ایک ہی دن ہوا تھا۔ جب میں سن ۲۰۰۰ء میں پاکستان سے ایم بی اے مکمل کر کے بسلسلہ کاروبار وہاں پہنچا تھا۔ پابلو نرودا کا پورٹریٹ ایک کتابوں کی دوکان پر آویزاں دیکھا اور گبریلا مسترال کی تصویر پانچ ہزار کے کرنسی نوٹ پر موجود تھی جسے اسی دن میں نے بغور دیکھا تھا اور اس کے متعلق ابتدائی معلومات کا مجھ پر انکشاف ہوا تھا۔ چلی، پیرو کے بعد جاپان میں چونکہ میرا قیام زیادہ رہا جہاں کے کرنسی نوٹوں پر یہ مشترک اور قابل تقلید بات نوٹ کی، جاپان کے دس ہزار ین کے کرنسی نوٹ پر بھی ایک شاعر کی تصویر ہے جو کہ جاپان کا سب سے بڑا کرنسی نوٹ ہے۔ ان کے علاوہ بھی بے شمار ملکوں میں پڑھنے لکھنے سے متعلق لوگوں کی تصاویر کرنسی نوٹوں پر موجود ہیں۔

تجویز تو یہ بھی دی جاسکتی ہے کہ قائداعظم کے علاوہ اقبالؔ، فیضؔ یا کسی اور شاعر، ادیب کی تصویر بھی کرنسی نوٹ پر ہونی چاہئے لیکن ہمارے ہاں مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہم کسی بھی شخصیت پر متفق ہی نہیں ہو پاتے ہیں اور بڑے سے بڑا آدمی بھی ہمارے ملک میں عام طور پر متنازعہ ہی رہتا ہے۔

اگر احمد فرازؔ کی تصویر بیس روپے کے کرنسی نوٹ پر موجود ہوگی تو اس سے فن کو اعتبار ملے گا لیکن فرازؔ صاحب جیسے سراپا محبت شخص کے بھی بے شمار ناقدین موجود ہیں۔ گرچہ میں اس فلسفے کو نہیں مانتا کہ پاکستان میں قحط الرجال ہے اس صورت حال کو زیادہ سے زیادہ نااتفاقی اور عدم برداشت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

ہماری کئی رسمیں بہت ہی خوبصورت ہیں جن میں سے ایک اچھی رسم یہ بھی ہے کہ جب کوئی شخص دیارِ غیر سے واپس لوٹتا ہے تو دوست احباب اور رشتہ داروں کے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لے کر آتا ہے۔ لاطینی امریکہ چونکہ دور افتادہ ہے اور دنیا کے اس حصے کی بہت کم چیزیں ہم تک پہنچ پاتی ہیں اس لئے اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ وہاں سے وطن واپسی پر کوئی نہ کوئی سوغات دوستوں کے لئے ضرور لے کر جاؤں۔ شعروسخن سے تعلق کی بنیاد پر حرفوں سے زیادہ معتبر کوئی چیز میری نظر میں تھی ہی نہیں۔ اس لئے میں اپنے لوگوں کے لئے اس سفر کی یادگار، یہ نظمیں لے کر آیا ہوں۔ ان نظموں کے ساتھ تعارف اور حواشی تحریر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قارئین کو اس ماحول اور پس منظر کا بھی اندازہ ہو سکے جس میں یہ نظمیں تخلیق کی گئی ہیں تا کہ ان سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہوا جا سکے۔

اس موقع پر صاحب طرز شاعر اور صحافی متو بھائی کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ وہ اس کتاب کی اشاعت کے بنیادی محرکات میں شامل ہیں۔ وہ کیسے؟ اس بات کی شائد انہیں بھی خبر نہ ہو مگر یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ متو بھائی نے کچھ سال پہلے مجھ سے گبریلا مسترال کی شاعری کا انگریزی ترجمہ لانے کی فرمائش کی تھی۔ اس کی وجہ ان کی مجھ سے محبت واپنائیت کے علاوہ یہ بھی تھی کہ میں ان دنوں چلی میں مقیم تھا، پہلے تو میں نے چلی میں اس کا انگریزی ترجمہ تلاش کیا جو کہ مجھے نہ مل سکا، وجہ قابل فہم تھی چونکہ وہاں ہسپانوی زبان بولی جاتی ہے اور انگریزی پڑھنے والے لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی دوران میرا کئی بار امریکہ جانا ہوا اور بعد از تلاش بسیار میں وہاں بھی مسترال کی شاعری کا انگریزی ترجمہ ڈھونڈنے میں ناکام رہا۔ اس پر نیویارک سے میں نے متو بھائی کو پوسٹ کارڈ بھیجا کہ میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکا۔

میرے بڑے بھائی رانا بابر حسین جو آج کل ممبر پارلیمنٹ ہیں ان دنوں لندن میں مقیم تھے، میں نے اپنا مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا اور مسترال کی شاعری کا انگریزی زبان میں ترجمہ لانے کو کہا۔ جب وہ پاکستان آئے تو اپنے ساتھ دو کتابیں تو لے کر آئے مگر پابلو نرودا کی نظموں پر مشتمل اور بتایا کہ انگلینڈ میں بھی مسترال کا ترجمہ دستیاب نہیں ہے۔ میں نے متو بھائی سے تو معذرت کر لی مگر سوچا کہ وہ تو ہسپانوی زبان نہیں پڑھ سکتے اس لئے گبریلا مسترال کی شاعری سے لطف اندوز ہونے سے قاصر ہیں مگر میں تو پڑھ سکتا ہوں، پتا تو چلے آخر اس نے ایسا کیا خاص لکھا ہے؟ لہٰذا میں نے مسترال کو پڑھنا شروع کیا اور پھر پڑھتا ہی چلا گیا۔ ان نظموں نے مجھے بے حد لطف دیا جس پر میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ شاعری کا ذوق رکھنے والے باقی دوستوں کو بھی اس خوشگوار اور منفرد تجربے سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا جائے۔

نرودا کے اٹلی میں قیام پر بننے والی فلم "IL POSTINO" دیکھنے کے بعد میں اسکی شخصیت کے سحر میں بری طرح گرفتار ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں اس کی شاعری پڑھنا شروع کی۔ "Residence on Earth" سے شروع ہونے والا یہ خوشگوار مطالعہ آج تک جاری ہے، جس کی کچھ نظموں کا ترجمہ اردو زبان کے قارئین کی نذر کر کے میں خوشی محسوس کر رہا ہوں۔

لاطینی امریکہ میں قیام کے دوران وہاں کے لوگوں نے جس گرم جوشی، محبت اور اپنائیت کا اظہار کیا یہ کتاب اس خلوص اور چاہت کے اعتراف کی ایک حقیری کوشش بھی ہے۔

گبریلا مسترال کی نظمیں

تعارف وترجمہ: عامر بن علی

سب دائرہ ہے

ستارے اک دائرے میں رقص کرتے ہوئے لڑکے ہیں
اس دنیا کے ساتھ جو چھپن چھپائی کا کھیل کھیلتے ہیں
گندم کے خوشے لڑکیوں کی کمریں ہیں
جو ترنگ میں جھومتی ہیں
ڈگمگاتی، ڈولتی اور بل کھاتی ہیں
دریا دائرے میں مشغولِ رقص لڑکے ہیں
جو سمندر اور طوفان سے پرانا کھیل کھیل رہے ہیں
سمندر کی لہریں دائروں میں رقص کرتی لڑکیاں ہیں
جنہوں نے زمین کو بازوؤں میں تھام رکھا ہے اور کھیل رہی ہیں
اور زمین اپنے ہونے پر نازاں ہے

سٹرابیری

سٹرابیری، بکھری ہوئی
پتوں کے نیچے گھونگھٹ اوڑھے
چنے جانے سے پہلے
ایک خوشبو
دکھائی دینے سے پہلے ایک مہکتا جھونکا
ننھے ننھے سوراخ
جو کسی پرندے کی چونچ کے نہیں ہیں
شبنم کے قطروں میں بھیگی ہوئی سٹرابیری
اسے توڑو مت اور نہ ہی اسے شاخ سے کاٹو
اتنی شیریں اور حسین چیز جیسے سٹرابیری
اس کے پیار کے لئے تم جھک جاؤ
اسے سانسوں سے محسوس کرو اور اسے ایک بوسے میں کھا جاؤ

اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو

تا سودی سلوریا کے لئے!
اپنا ہاتھ مجھے دے دو اور اپنی محبت مجھے دو
اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو اور میرے ساتھ رقص کرو
ایک تنہا پھول
اور اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں
ہم ایک پھول بن جائیں گے جب ملن ہوگا
ہم اپنے رقص میں وقت کو بھی شامل رقص کر لیتے ہیں
ایک ہی دھن میرے ساتھ مل کر گاتی ہوئی
ہم ملاپ سے تیز ہوا میں گھاس ہی فقط ہوں گے
میرا نام امید ہے اور تمہیں گلاب کہتے ہیں
مگر اپنا نام بھلا دینے سے ہم دونوں آزاد ہو جائیں گے
پہاڑوں پر ایک رقص اور اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں
ہم دونوں فقط پہاڑوں پر کیا جانے والا ایک رقص ہوں گے

بادلوں سے مکالمہ

اڑتے بادلوں کے ٹکڑو
مجھے بھی شبنم کے قطروں کی طرح زمین سے اٹھا لو
میری روح کو نیلے آسمان تک لے جاؤ
گھر سے بہت دور
جو میری آہ و بکاہ دیکھتا ہے
ان دیواروں سے پرے
جو مجھے ہر روز مرتا ہوا دیکھتی ہیں
آوارہ بادلو!
مجھے اڑا کر سمندروں کی جانب لے چلو
نغمہ سننے کے لئے
آتی جاتی ہوئی لہروں کا
بادلو! پھولو! چہرو!
مجھے اس کا خاکہ بنا کر دے دو
جو کہ پہلے ہی دھندلا سا گیا ہے یادوں میں
ایمان شکن وقت اور بے یقینی کے ہاتھوں
میری روح پامال ہونے لگتی ہے
اگر میں اسے دیکھ نہ سکوں
اے جاتے بادلو ٹھہرو ذرا
رحم کرو اور ٹھنڈا کر دو
میرے سینے کو
اور میری پیاس بجھا دو

تین درخت

تین گرے ہوئے درخت
ایک شاہراہ کے کنارے پڑے ہیں
لکڑہارا انہیں بھول چکا ہے
اور وہ باتیں کر رہے ہیں
محبت میں مصروف
تین اندھے آدمیوں کی طرح
ڈوبتا ہوا سورج اگل رہا ہے
اپنا چمکیلا خون
ٹوٹی ہوئی شاخوں کے اوپر
اور ہوا ان سے خوشبو چرا کے لیے جا رہی ہے
ایک مڑی ہوئی ٹہنی
اس کا ایک بڑا بازو لرزتے ہوئے پتوں کے ساتھ
ایک دوسری ٹہنی کے زخموں کی طرف دیکھ رہا ہے
ایسے لگتا ہے جیسے دو آنکھیں ہوں
التجاؤں سے بھری ہوئی
لکڑہارا انہیں بھول چکا ہے
رات دبے پاؤں چلی آتی ہے میں ان کے ساتھ رہوں گی رات بھر
میں اپنے سینے میں بھر لوں گی ان درختوں کا رس اور برادہ
وہ مجھے گرم جوش رکھے گا
اور نیا طلوع ہونے والا دن ہمیں دکھی سنگت میں پائے گا
خاموش
ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے

پابلو نرودا کی نظمیں

تعارف و ترجمہ: عامر بن علی

بعد از دوپہر کی طرف جھکاؤ

سہ پہر کی طرف جھکتا ہوا میں اپنا اداس جال پھینکتا ہوں
تمہاری سمندر جیسی آنکھوں کی طرف
میری تنہائی کا ایک شدید طوفان جو طویل بھی ہے اور
شعلوں میں لپٹا ہوا بھی
میری تنہائی ایک ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح بازو مار رہی ہے
میں تمہاری کھوئی ہوئی آنکھوں کو سرخ اشارے دے رہا ہوں
جو سمندر کی لہروں جیسی یا پھر ساحل کنارے مینارِ نور جیسی ہیں
تم نے فقط اندھیرے اکٹھے کیے ہیں
اے میری دور کی خاتون
تمہاری نگاہوں پہ کبھی کبھی سمندری ساحل کا گمان ہوتا ہے
سہ پہر کی طرف جھکتا ہوا میں اپنے دکھوں کا جال پھینکتا ہوں
اس سمندر کی طرف جو تمہاری آنکھوں کے ساگر سے بنا ہے
رات کے پرندوں نے پہلے ستاروں پر صدا لگائی ہے
جو میری روح کی طرح منور ہیں جب میں تم سے پیار کرتا ہوں
رات کا گھوڑا اپنے سوار کی پرچھائیاں لیے
زمین پر اپنے نیلے سموں کے نشان چھوڑتا آگے بڑھ رہا ہے

میں چاہتا ہوں کے تم خاموش ٹھہری رہو

میں چاہتا ہوں کہ تم خاموش ٹھہری رہو: ایسے ہی جیسے تم
موجود ہی نہ ہو
اور تم مجھے ایسے سنو جیسے میں بہت دور سے بول رہا ہوں
اور میری آواز تمہارے کانوں تک نہ پہنچے
ایسے لگتا ہے گویا تمہاری آنکھیں کہیں دور پرواز کر گئی ہیں
اور یہ لگتا ہے کہ ایک بوسے نے تمہارا منہ بند کر دیا ہے
جیسے تمام چیزوں میں میری روح بھر گئی ہے
تم چیزوں میں سے باہر نکلتی ہو اور میری روح سے بھری پڑی ہو
تم میری روح کی طرح ہو
ایک خوابوں کی تتلی
اور تم کسی جادوئی اسم کی طرح ہو
میں چاہتا ہوں کہ تم خاموشی سے ٹھہری رہو
اور ایسے لگے جیسے تم بہت دور ہو
گرچہ ایسا سنائی دیتا ہے جیسے تم لہرا رہی ہو
ایک تتلی جو ہدہد کی طرح لپکتی ہے
اور تم مجھے دور سے سن رہی ہو اور تمہیں میری آواز نہیں پہنچ رہی
مجھے اجازت دے دو کہ میں بھی تمہاری خاموشی میں
اپنی خاموشی کے ساتھ شریک ہو جاؤں
اور مجھے اپنی خاموشی کے ساتھ بات کرنے کی بھی اجازت دے دو
جو کہ شمع کی طرح روشن اور انگوٹھی کی طرح سادہ ہے
تمہاری مثال رات جیسی ہے
اس کے ٹھہراؤ اور بھید بھری خاموشی جیسی
تمہاری خاموشی ستارے جیسی، اتنی دور اور سادہ
میں چاہتا ہوں تم خاموش ٹھہری رہو
گرچہ یہ ایسا ہی ہے گویا تم موجود ہی نہ ہو
دور اور دکھ سے بھری جیسے تم مر گئی ہو
پھر فقط ایک ہی لفظ
ایک مسکراہٹ ہی کافی ہے
اور میں خوش ہوں
خوش اس واسطے کہ یہ سچ نہیں ہے

جلتا چاند، بھری عورت اور پھل

جلتا چاند، بھری عورت اور پھل
سمندری گھونگھوں کی اندھی مہک
کیچڑ اور روشنی کا رچاؤ
تمہارے ستونوں کے درمیان کیا خفیہ علم پوشیدہ ہے
محبوب کے ساتھ پہلی رات میں آدمی اپنے حواس سے کیا
چھوتا ہے؟
اُف، محبت کا سفر پانیوں اور ستاروں میں سے ہو کر گزرتا ہے
سانس پھلا دینے والی کثیف ہوا، حبس اور گرمی کا سفر
محبت روشنی کی جنگ ہے
اور دو جسم پامال ہوئے ایک ہی چاشنی سے
بوسہ بہ بوسہ میں تمہاری ننھی لامتناہیت کو سر کر رہا ہوں
تمہارے دریا، کونے اور میدانوں میں بسے گاؤں
اور خوشی و سرمستی سے آگ کے گولے میں تبدیل ہوتی ہوئی تم
خون کی ننھی ننھی شریانوں میں تپتے لہو کی تیز گردش
جس سے تمہیں اک نیا جنم ملا ہے
اس جنم میں تم اور کچھ نہیں فقط اندھیرے میں روشنی ہو

پھول کی پہیلی

فتح۔ دیر سے آئی ہے۔ میں نے نہ سیکھا تھا
کس طرح سے پہنچا جائے
کنول کی طرح کنویں پر
سفید پیکر لیے، چھنکتی سفیدی
بے حرکت مگر ابدیت کی مالک زمین
کبھی واضح تو کبھی دھندلے جسم سے ظاہر
گھنٹہ بجنے کی آواز تک
وہ چکنی مٹی
اک سفید کرن کے ساتھ یا پھر دودھیا اجالا لیے
اپنے کپڑے پھاڑ کر بے لباس، مٹی کا گہرا اندھیرا
کون سی چٹان پر جانا پھول کا سؤ بھاؤ ہے
جب تک اس کی سفیدی کا پرچم آگے بڑھتا ہوا
توہین آمیز رات کے اندھیروں کو شکست دیتا ہوا
اور، روشنی کی حرکت سے
خود کو ایک حیران کن بیج میں بدلتی ہے

اور...... میں نے راز فاش کر دیا!

حافظ مظفر محسن

''یہ راز تھا کہ میں ہر روز ماں کی قبر پر جاتا ہوں''

میں نے سوچ رکھا تھا کہ یہ بات کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ کبھی کسی سے اس حوالے سے گفتگو نہیں کروں گا۔ یہ میرا اور ماں کا معاملہ ہے۔ میں روزانہ اللہ پاک کے حضور سر جھکاتا ہوں۔ اُس سے ہم کلام ہوتا ہوں اور یا پھر ہر روز کئی بار ماں کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ ماں سے ہم کلام ہونا تو میرے معمول کا حصہ ہے۔ جیسے دعاؤں کی سیل لگی ہو اور ہر ذی روح کو ہر لمحہ دُعاؤں کی ضرورت ہے۔ سہاروں کی تلاش ہے۔

ماں میری باتیں سنتی ہے اور سن کر ہنس دیتی ہے اور میں رو دیتا ہوں۔ ''ماں کہتی ہے تو تو مرد کا بچہ ہے۔ مت رویا کر۔ پر وہ مایوس ہو جاتی ہے۔ آہستہ سے کہتی ہے۔ تجھے پاس بھی نہیں بلا سکتی۔'' میں چپ ہو جاتا ہوں اور پھر میں بول نہیں پاتا۔ کیونکہ ماں بھی تو رو رہی تھی اور میں ماں کو دکھی دیکھ سکوں یہ ممکن نہیں۔

جب زندہ تھی تو اِک دن میں نے پوچھا ''ماں! یہ ہر نماز کے بعد کس کے لیے اتنے خشوع وخضوع سے دعا مانگتی ہو''

''پتر تیرے لیے'' وہ درود شریف پڑھتے ہوئے بولی۔

''ماں! شروع کس سے کرتی ہو''

بولی ''تجھ سے''

''ماں! اختتام کس دعا پر کرتی ہو؟''

''تیری سلامتی، تیری زندگی کی دعا پر''

ماں کی دعاؤں کا محور بس میں ہی ہوں؟ واہ...... واہ سبحان اللہ۔

''ماں! سب بچوں کو مار پڑتی تھی۔ تم نے مجھے کبھی نہیں مارا۔ ڈانٹا تک نہیں؟''

ماں ہنس دی ''پتر تجھے یاد نہیں۔ میں نے اِک بار جب تم نے اپنی دادی اماں کی بات نہیں مانی تھی تجھے ڈانٹا تھا لیکن تم نے دادی اماں کا ماتھا چوم کر معافی مانگ لی تھی اُن سے۔ جب اُنہوں نے پیار سے تجھے سینے سے لگایا تو مجھے افسوس ہوا کہ میں نے تمہیں کیوں ڈانٹا۔ کیوں کہ وہ تجھے مجھ سے بھی زیادہ پیار کرتی تھیں۔

آج خلیل الرحمٰن قمر کا فون آیا تو ہنستے ہوئے بولا ''ذرا پہچانیے۔ آپ کا بچپن کا دوست'' بہت بھاری بھرکم آواز تھی۔ میں پہلی ''ہیلو'' پر ہی دوستوں کو پہچان لیتا ہوں۔ مشکل ہوئی تو میں نے مایوسی ظاہر کر دی۔ اتنی بھاری بھرکم ڈرا دینے والی آواز؟

وہ بولا ''میں بھی بچپن میں ڈرامے لکھا کرتا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی گلی میں رہتے تھے لیکن اک دوجے سے ناواقف تھے۔ اک رسالے میں آپ کی بھی تحریر چھپی اور میری بھی۔ میں نے اڈیٹر سے آپ کے گھر کا ایڈریس پوچھا اور......!''

''بس جی بس...... خلیل خاں فاختہ والے'' میں نے پہچان لیا۔ وہ خوب ہنسا۔

''اُس وقت بھی آپ نے میرا نام بگاڑ رکھا تھا۔ سوری بھئی خلیل الرحمٰن قمر۔ اب تو آپ ملک کے بہت بڑے ڈرامہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ جب سے آپ کا مشہور ٹی وی پلے ''بوٹا فرام ٹوبہ ٹیک سنگھ'' چلا۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہت شہرت عطا کی۔ خیر سے یہ شہرت اور عزت والا شعبہ بلندی کی طرف گامزن ہے۔

''کب آؤ گے ملنے۔''

''ابھی دل چاہتا ہے۔ آپ سے ملنے کو۔ دو منٹ پہلے آپ کے دوست سیّد اظہار الحق شاہ سے آپ کا موبائل نمبر ملا ہے اور دیکھ لیں بغیر وقت ضائع کیے آپ سے مخاطب ہوں۔ بہت مدت سے آپ کی تلاش میں تھا۔ ملنے کی جستجو میں رہا۔''

وہ بولا ''آپ کہاں رہتے ہیں آج کل''

''خلیل صاحب! میں وہیں شاد باغ میں ہی رہتا ہوں۔ جہاں آپ اکتیس سال پہلے مجھے ملنے آئے تھے۔ جب میں سکول میں پڑھتا تھا۔ اور آپ؟''

''میں جوہر ٹاؤن میں رہتا ہوں'' وہ بولا۔

''تو کبھی آؤ ناں شاد باغ...... اپنی جنم بھومی دیکھنے۔ اسی بہانے ہم سے بھی ملاقات ہوگی۔ کچھ پرانی یادیں تازہ ہوں گی۔ گلے شکوے کرنے کی ہمیں عادت نہیں۔

''ہر پندرہ دن بعد آتا ہوں شاد باغ لیکن صبح فجر کی نماز کے وقت''

''یا اللہ خیر...... منہ اندھیرے کیوں؟'' میرے منہ سے نکلا تو خلیل الرحمٰن قمر کی آواز بھرا گئی ''ماں سے ملنے''

''میں تو روز جاتا ہوں'' میں نے بتایا تو بول اُٹھا۔

''حافظ صاحب! آپ تو خوش قسمت ہیں''

''دل میرا بھی یہی چاہتا ہے پندرہ دن بعد جاتا ہوں اور کافی دیر ماں کے پاس بیٹھتا ہوں۔ باتیں کرتا ہوں چلا آتا ہوں''

مجھے خلیل پر پیار آنے لگا۔ اس کی والدہ کم عمری میں ہی فوت ہو گئی تھیں۔ پیر رونقی قبرستان میں دفن ہوئیں۔ یہ خلیل الرحمٰن قمر تو ویسے بھی محبت کرنے والا شخص ہے۔ ماں سے اس قدر محبت کرتا ہے یہ راز مجھ پر آج آشکارہ ہوا۔ ہمارے بزرگ دوست شوکت نواز پیرزادہ بھی بیس سال سے ہر جمعرات کو ماں کی قبر پر جاتے ہیں۔ بیٹھ کر آنسو بہاتے ہیں دعا مانگتے ہیں چلے آتے ہیں۔

خلیل صاحب چلیں وعدہ۔ اب میں اپنی ماں سے ملنے پیر رونقی قبرستان جایا کروں گا تو آپ کی والدہ کی قبر پر بھی حاضری دیا کروں گا۔ دعا کیا کروں گا۔

''یہ راز تھا کہ میں ہر روز ماں کی قبر پر جاتا ہوں۔ آج مجھے یہ راز کھولنا پڑا۔ جب میرے بیٹے نے اپنی ماں کی حکم عدولی کی۔ میں نے اُس کو ڈانٹا۔ اس کا کان بھی مروڑا اور سمجھایا ''بیٹا! ماں کی دعا لو۔ یہ دعا عرش تک جاتی ہے۔ انسان خود کے لیے اس قدر محبت سے دعا نہیں مانگ سکتا جس قدر محبت سے ماں اپنے بچے کے لیے دعا مانگتی ہے اور ماں کی بددُعا سے بچنا۔ یہ بددُعا بھسم کر کے رکھ دیتی ہے۔ دنیا میں بہت سے بدبخت تباہ ہو گئے۔ محض ماں کے دل سے نکلی ''آہ'' کے باعث!''

بیٹے کو جلدی میری بات سمجھ آ گئی۔ اُس نے اپنی ماں سے معافی مانگی۔

اُس کی ماں نے اس کے چھوٹے چھوٹے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور محبت سے اس کا ماتھا چوما۔

میں نے اُسے پاس بلایا۔ ہم دونوں باپ بیٹا علیحدہ ہو کر بیٹھ گئے۔ ''پاپا! میں آپ کی بات نہ مانوں۔ آپ چپ رہتے ہیں کچھ نہیں کہتے۔ ڈانٹتے بھی نہیں لیکن آپ مجھے ''ماں کی محبت'' سے ڈرائے رکھتے ہیں۔ کیا آپ کو بھی اپنی ماں سے بہت محبت تھی اور وہ آپ کو کبھی یاد بھی آتی ہیں''

احمد یہ طویل سوال میرے دل میں اُتر گیا اور میں رو دیا۔ میرے آنسو میری آنکھوں سے اُتر کر احمد کے چھوٹے چھوٹے گالوں پر گرنے لگے اور میں نے اپنا یہ راز فاش کر دیا کہ ''میں ہر روز ماں کی قبر پر جاتا ہوں'' احمد حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے میرے آنسو ٹشو پیپر سے پونچھنے لگا۔

دوغلی

ثمینہ سیّد

''سرمد میں دانستہ پریشان نہیں ہوتی۔ یہ پریشانیاں، دکھ، طعنے اور منفی رویے میری روح کو زخمی کر رہے ہیں'' ابہر نے اُنگلی کی پور سے آنکھ کا کونا صاف کیا۔ سرمد کرسی کھینچ کے قریب ہو بیٹھا۔

''اب تو میں کھل کے ہنس بھی نہیں پاتی۔ جب بہت کام تھے بہت ساری ذمہ داریاں تھیں تب بھی ایسی آوازاری نا تھی'' ابہر کے سینے سے سرد آہ نکلی۔

''میری محبت کافی نہیں ہے کیا؟'' سرمد نے اس کے ہاتھ اپنے گرم مضبوط ہاتھوں میں دبائے۔'' ہر وقت ہر لمحہ تو میں تمہارے ساتھ ہوں''

''ہاں تم تو ساتھ ہو مگر میں بہت اکیلی ہوگئی ہوں۔ سرمد! اب مجھے تمہاری ضرورت تب محسوس ہوتی ہے جب تم میرے پاس نہیں آسکتے۔ جب میں اور امی اکیلے ہو جاتے ہیں، جب مجھے خوف گھیر لیتا ہے کہ امی کو کچھ ہوگیا تو......'' ابہر کی آواز میں لرزش بہت واضح تھی۔

''اوہ جان! یہ سب تمہارا وہم ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا'' سرمد نے طفل تسلی دی جو اسے خود بھی جھوٹ لگی۔

''سرمد! کبھی کبھی محبت کافی نہیں ہوتی۔ وہ محبت جس کے لیے ہم ترس رہے ہوتے ہیں ہمیں مل جائے تو پھر ساتھ بھی چاہیے۔ قربت بھی، تحفظ بھی۔ سچ مچ کا ساتھ۔ خوابوں سے گزارا نہیں ہوتا'' ابہر جو سمجھانا چاہ رہی تھی سرمد جان بوجھ کے انجان بن رہا تھا لیکن آج ابہر بھی فیصلہ کر کے بیٹھی تھی کہ بات ٹھکانے لگا ڈالے۔ خاموش نظروں سے سرمد کو دیکھتی رہی اور وہ ڈھیٹ بنا مسکراتا رہا۔

''ہم اپنے تعلق کو رشتہ کیوں نہیں بنا سکتے؟ ہم مکمل طور پر آزاد اور خودمختار ہیں'' ابہر سرمد کے بالکل خاموش چہرے پہ نگاہیں ٹکائے بیٹھی رہی۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر اُٹھ گیا۔

''چلتا ہوں یار میری زینی کو صبح بہت تیز بخار تھا۔ اس کی ماں تو ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں لے جاسکتی۔ تمہیں تو پتہ ہے وہ میرے بغیر گھر سے قدم بھی نہیں نکالتی۔'' سرمد یہ کہتے ہوئے چلا بھی گیا۔ دروازہ ہلتا رہا اور آج پہلی بار ابہر کو لگا سرمد یہ جتا رہا تھا کہ اس کی بیوی کس قدر مشرقی ہے اور میں...... ''سرمد میں گھر سے باہر تو جاتی ہوں، کما کے لاتی ہوں اپنا اور اپنے بہن بھائیوں کا پیٹ پالنا تھا۔ اب میرے اور امی کے سو خرچے ہیں۔ کون اُٹھائے، کون مجھے کہے آج تم آرام کرو ابہر مجھ سے لو۔ جو چاہیے۔''

ابہر اسماعیل ایک کلرک کی بیٹی تھی۔ اسے پولیس کی نوکری کا جنون تھا۔ اسماعیل حیدر کی چار بیٹیاں ہی تھیں۔ بیٹا نہ ہونے کا روگ دونوں میاں بیوی کو اندر اندر کھا رہا تھا۔ ابہر کی نوکری کا پہلا دن تھا جب باپ کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ جانبر نا ہو سکا۔ بس اسی دن سے ساری ذمہ داریاں ابہر کے کندھوں پہ آپڑیں۔ وہ لڑکوں جیسی بہادر تھی۔ ایک موٹر سائیکل لے لی اور زندگی کے جہاد پہ نکل پڑی۔ بہن بھائیوں کو چھوڑنا، لانا، ان کی خوشیاں غم، فکریں کرتے کرتے کسی لمحے سرمد بھی زندگی میں آ گیا۔ سرمد انکم ٹیکس آفیسر تھا ایک کیس کے سلسلے میں ابہر سے ملنے اس کے تھانے آیا اور پھر بہانے بہانے آتا رہا۔ نجانے کب مردانہ سی عادات والی ابہر دل میں اُتر گئی تھی۔ ابہر کو بھی سرمد کی توجہ بہت اچھی لگنے لگی۔ دونوں میں دوستی کیا ہوئی زندگی جیسے آسان اور خوبصورت ہوگئی۔ ابہر کو اپنا آپ اچھا لگنے لگا۔ وہ غیر محسوس طریقے سے نسوانیت سے بھرنے لگی۔ پہننے اوڑھنے، بننے سنورنے لگی۔ ایک ایک بات سرمد کے ساتھ کر کے جیسے وہ ہلکی پھلکی ہو جاتی تھی۔ وہ اکثر سرمد کی شدتوں کے جواب میں کہتی ''بس میری چند ذمہ داریاں پوری ہو لیں پھر ہم بھرپور زندگی گزاریں گے'' اور اب......اب تو ذمہ داریاں پوری ہو گئیں مگر وہ بھرپور زندگی کہاں ہے۔

''تم ذرا سا ذہن پہ زور ڈالو تو یاد آئے گا تمہیں ہر وہ لمحہ...... جب میں تڑپ رہا تھا کہ ہم صرف نکاح ہی کر لیتے ہیں۔ میرے گھر والوں کا منہ تو بند ہو جائے۔ مگر تمہاری ایک ہی رٹ تھی ذمہ داریاں، ذمہ داریاں''

سرمد جھنجھلا کر بولا تو وہ پاس آ بیٹھی ''سرمد! تب ممکن نہیں تھا تم تو مجھ سے پوری طرح واقف ہو۔''

''میں تمہارے ساتھ ہوں یہ کافی نہیں؟ میں عمر بھر تمہارے ساتھ رہوں گا۔ تم نے یہ کیسی ضد پکڑ لی ہے؟''

''سرمد! مجھے تمہارا نام بھی چاہیے۔ مجھے رات دن کا ساتھ بھی چاہیے۔''

''تمہارے کہنے پہ شادی کی تھی میں نے۔ اب کیا کروں؟ سرمد نے نا صرف یاد دلایا اپنی بے بسی بھی دکھا دی۔

''اب سرمد؟؟'' وہ سراپا سوال بنی ہوئی تھی۔

''امی ابا کی وفات کے بعد بیوی بچوں کو ایک رات بھی گھر میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ میری روح تو تمہارے ساتھ ہے میری جان مگر وہ جو میری ذمہ داری ہیں ان کا کیا کروں؟'' سرمد نے لنگڑی لولی مجبوری پیش کی اور آج پھر بات ادھوری چھوڑ کے اُٹھ گیا۔

رات کا سناٹا گہرا ہو رہا تھا۔ عجیب خوف سا فضا میں گھلا ہوا تھا اور امی کی ہائے ہائے ابہر کے حواس معطل کر رہی تھی۔ پھر نجانے کیا ہوا فضا میں سناٹا بڑھ گیا ابہر سناٹے میں ڈوبتی اُبھرتی رہی پھر سہمے سہمے قدموں سے ماں کے پاس چلی آئی...... ''امی امی جان ن ن ن'' ابہر کا بہادر سا دل ڈوب گیا۔ اس نے امی کی ناک کے آگے ہاتھ رکھ کے سانس محسوس کی پھر بجلی کی سی تیزی سے اُٹھی اور ایک...... دوسرے اور پھر تیسرے بہنوئی کو فون کر کر کے پاگل ہونے لگی۔ کوئی فون اُٹھا ہی نہیں رہا تھا۔ وہ ہمت کر کے اُٹھی اور امی کو سہارا دے کے باہر تک لائی۔ گاڑی میں ڈالا اور ہسپتال لے آئی۔ آج تنہائی اور بے بسی کی حد ہوگئی۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ تبھی ڈاکٹر نے امی کے ہوش میں آنے کی اطلاع دی۔

یہ رات خوف بن کے دل میں جا گزیں ہوگئی تھی۔ اگلے کچھ دن وہ اسی خوف میں رہی۔

خوف اور وحشت کے انہی دنوں میں جمشید گورایا نے ابہر سعید کو پرپوز کر دیا۔ وہ حیران تھی لوگ بات کرتے ہوئے کچھ بھی خیال نہیں کرتے۔ جمشید گورایا تحصیلدار تھا۔ ساٹھ

سال کا بوڑھا مگر صحت مند، بڑھے ہوئے پیٹ والا شوقین مزاج سا مرد۔ ابہر سعید کو اچانک خود سے نفرت ہونے لگی ''تو ابہر سعید اب تیری یہ اوقات ہوگئی'' آفس میں گھومتے ہوئے اس نے خود کلامی کی۔

پھر چلا کر کانسٹیبل کو بلایا'' جاکر جمشید گورایا کو بتاؤ کہ میڈم نے کہا ہے آئندہ میرے آفس میں قدم رکھا تو جیل میں سڑتے نظر آؤ گے۔''

وہ سب کو بڑے دھڑلے سے کہتی تھی ''شادی کرنا، مرد کی محکومی کرنا پسند ہی نہیں، مجھے تو حیرت ہوتی ہے عورتیں کس طرح مردوں کی جرابیں، بنیانیں دھوتی ہیں، کپڑے اِستری کر کر کے ہینگرز بھر دیتی ہیں۔ کھانے پکا پکا کر معدے کے ذریعے دل میں اترنا چاہتی ہیں جبکہ مرد کا دل تو صحرا کی طرح ہے پیاسا کا پیاسا جلتا تھل...... جو سیراب ہو ہی نہیں پاتا۔ جسے ہمیشہ نئی بارشوں کا انتظار رہتا ہے اور وہ پوری شدتوں سے ان نئی بارشوں میں بھیگنا چاہتا ہے۔ ہمیشہ ہر موسم مین، عمر کے ہر سال میں اس کے ہونٹ خشک ہو جاتے ہیں۔ مرد کے اندر تو محبت کی کسی ایک بارش کو جذب کر کے سیراب ہو جانے کا جذبہ ہے ہی نہیں۔''

وہ بڑے فخر سے کہتی ''میں داسی نہیں بن سکتی''

مگر درحقیقت وہ پوری عورت تھی۔ بے بس، تمناؤں سے بھری ہوئی، محبوب کی ایک جھلک کو ترسی ہوئی، اس کے اندر بھی مرد کی جرابوں اور بنیانوں کو سنبھال کے رکھنے والی حسرتیں روز روتی رہتیں۔ مگر وہ اپنی مجبوریوں اور ذمہ داریوں کی وجہ سے یہ جملہ حقوق کسی کے نام کر کے اپنے کام نمٹانے میں لگ گئی۔ سب کام ختم ہو گئے تو اب وہ سرمد کے لوٹ آنے کا انتظار کرنے کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتی تھی۔

سرمد کی محبت کی جگہ واہموں اور سناٹوں نے لے لی۔ وہ کئی دن سے نہیں آسکا تھا۔ فون پہ کہہ دیتا'' جان بہت بزی ہوں۔ آج آنے کی کوشش کروں گا۔'' وہ آج...... آٹھ دن سے نہیں آیا۔

''آپ شادی کیوں نہیں کرتیں ابہر......!!'' شہباز رضی نے چیٹ کرتے ہوئے لکھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر ابہر نے لکھا ''جو پرپوز کرتے ہیں وہ زہر لگتے ہیں اور جو پرپوز نہیں کر پا رہا وہ مجبور ہے آپ کو میں نے بتایا تو تھا''

''مرد کبھی مجبور نہیں ہوتا مس ابہر!! جو خود کو مجبور کہتے ہیں وہ مخلص نہیں ہوتے اصل میں'' شہباز کی بات پہ ابہر کا دل زور سے ہنسا ''وہ انجان بندہ سمجھ گیا۔ ابہر تجھے سمجھ نا آئی''

''وہ مجھ سے محبت کرتا ہے لیکن شادی......''

''اپنا فقرہ مکمل کریں کہ وہ دوسری شادی کرنے پہ تیار نہیں'' شہباز نے آگہی کا ایک اور در وا کیا۔

''ہماری محبت اس کی شادی سے بہت پہلے کی ہے'' ابہر نے خود کو تسلی دی ''اور مجھے شادی پسند بھی نہیں شہباز صاحب''

''آپ نے خود کو دوغلی زندگی گزارنے پہ مجبور کر رکھا ہے ورنہ آپ بھی بہت عام سی لڑکی ہیں خواب سجانے والی، کمزور سی......اور سہارے کے لیے مرد کے مضبوط بازوؤں کا انتظار کرنے والی'' ابہر نے پڑھا اور فوری طور پر آف لائن ہوگئی۔

شہباز رضی سے کافی پرانی سلام دعا تھی۔ شہباز کی بیوی دس سال پہلے وفات پا گئی تھی۔ ایک بیٹا تھا جو ڈاکٹر بنتے رشیا گیا ہوا تھا۔ شہباز اسلام آباد کے ایک آرمی کالج میں پروفیسر تھے۔ ابہر نے اپنے اور سرمد کے متعلق بتایا تھا۔ اپنی بہنوں کی شادیوں اور سرمد کی مجبوریوں کے تذکرے بھی کیے تھے۔ ''پھر آج شہباز نے ایسے کیوں کہا کہ سرمد مخلص نہیں......'' ابہر نے کرسی کی پشت سے سر ٹکایا۔ نجانے کیوں آج آنکھوں میں سرمد کی دلکشی سے مسکراتی شبیہہ نہیں اُتر سکتی۔

وہ کچھ لمحے بے جان سی پڑی رہی پھر ایک جھٹکے سے سیدھی ہو بیٹھی۔

''آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟'' ابہر نے لکھا کچھ دیر خاموشی رہی۔ دل نجانے کن واہموں میں ڈوب اُبھر رہا تھا۔

''مجھے انتظار تھا کہ آپ پرپوز کریں۔ ہاہاہاہا''

''آپ میرا مذاق اُڑا رہے ہیں؟'' ابہر بے حد شرمندہ ہوئی۔

''نہیں میں بھی تنہائی سے تھک گیا ہوں۔ مجھے آپ کا ساتھ چاہیے'' شہباز نے بے جھجک لکھا تو ابہر مزید کچھ کہے بغیر اپنا ایڈریس لکھ کے آف لائن ہوگئی۔ وہ بھی تو تھک گئی تھی دوغلی زندگی گزارتے گزارتے......

بس ترا ہم نے اشارہ دیکھا
موج دیکھی نہ کنارہ دیکھا
زندگی بھر تمہیں سوچا ہم نے
عمر بھر خواب تمہارا دیکھا
دوستی کی تو بھروسے پر کی
نفع دیکھا نہ خسارہ دیکھا
جو زمانوں کے غموں سے چھوٹا
وہ گرفتار تمہارا دیکھا
آنکھ کھلتے ہی نظر آیا وہ
کیسا رنگین نظارا دیکھا
جب بھی مشکل کوئی آڑے آئی
تیری بانہوں کا سہارا دیکھا
شمع کی طرح جلے صبح تلک
حوصلہ کس نے ہمارا دیکھا
دل تو میرا تھا مگر جانِ جہاں
وہ طرفدار تمہارا دیکھا
جانے تعبیر ستارہ کیا ہو
میں نے ٹوٹا ہوا تارا دیکھا

(شکیلہ ستارہ)

نہ موقلم، نہ پرندے، نہ چشمِ نم میرے بعد
رکھے گا کون تیرے باغ میں قدم میرے بعد
ہوائے شام! تیری بازگشت مجھ تک ہے
کرے گا کون میرے رفتگاں کا غم میرے بعد
مگر یہ رقص بغیر کمان و تیر و تبر
رہے گی شہرِ غزالاں میں رسم رَم میرے بعد
جنوں میں صحو، خبر میں حلول بے خبری
یہ ساز و رفت نہ ہوگا کبھی بہم میرے بعد
بہت قدیم سروکار جائے گا میرے ساتھ
پئے گا کون تیری بے رُخی کا سم میرے بعد
ورق پہ صرف خطِ مستقیم دیکھو گے
نہیں رہیں گے یہ باتوں کے پیچ و خم میرے بعد

(شناور اسحاق)

ناصر زیدی/لاہور

جو بھی دیکھے گا یقیناً وہ چرا لے گا اُسے
تیری تصویر کو یوں ساتھ لیے پھرتے ہیں

ناصر زیدی کا شمار ہمارے عہد کے نہایت معتبر شعراء میں ہوتا ہے۔ اُن کا تعلق اساتذہ کے اُس قبیلے سے ہے جن سے بہت سے شعراء نے فیض حاصل کر کے شعروادب میں اپنا مقام بنایا۔ ناصر زیدی کی غزل میں وہی چاشنی ہے جو کلاسیکل غزل کی پہچان ہے۔ وہ روایت اور جدت کا گہرا مطالعہ، ادراک اور شعور رکھتے ہیں۔ فنی اعتبار سے بہت سے اساتذۂ شعر ان سے فیض حاصل کرتے ہیں۔

چشمِ بینا سے بھی جن کو کچھ نہ آتا ہو نظر
عقل کے اندھے اُنہیں کہیے، نہ کہیے، بے بصر
اس کو دُنیا کی لغت میں کیا کہوں؟ قسمت کا پھیر
کل تلک جو عرش پر تھے، آج ہیں وہ در بدر!
جن سے مل کر میں کنارا کش رہا وہ لڑکیاں
کیسی کیسی بددُعا دیتی رہی ہیں عمر بھر
جس کی خاطر پائے استقلال بے لغزش رہے
آج تک نظروں میں پھرتی ہے اُسی کی رہگزر
بد نظر لوگوں سے بچنے کے لیے لازم ہے یہ
اے حسینہ! کچھ تو اپنے حُسن کی خیرات کر!
جس کے سینے میں نہیں حساس دل کی دھڑکنیں
اُس پہ میرے حرف، میرے لفظ، یکسر بے اثر
گھر بسا لو، اب نیا تم بھی میاں ناصرؔ کوئی
اس طرح سے کب کسی کی زیست ہوتی ہے بسر

شہر در شہر جنوں ساتھ لیے پھرتے ہیں
نہیں معلوم کہ کیوں ساتھ لیے پھرتے ہیں
ایک طوفانِ بلاخیز ہے دل کے اندر
اور اک قلزمِ خوں ساتھ لیے پھرتے ہیں
کیا سراپا ہے کہ بے تاب کیے رکھتا ہے
اُس کے پیکر کا فسوں ساتھ لیے پھرتے ہیں
جو بھی دیکھے گا یقیناً وہ چرا لے گا اُسے
تیری تصویر کو یوں ساتھ لیے پھرتے ہیں
کھل نہ جائے کہیں آشفتہ مزاجی کا بھرم
اپنے حالاتِ زبوں ساتھ لیے پھرتے ہیں
ہاتھ پھیلایا تھا کم ظرف کے آگے، ہم نے
سر ندامت سے نگوں، ساتھ لیے پھرتے ہیں
پاس رہتا ہے تصور میں وہ میرے ناصرؔ
کتنا بے درد سکوں، ساتھ لیے پھرتے ہیں

صبح اُٹھ کر تری تصویر پہ آ پڑتی ہے نظر!
اس طرح ان دنوں ہوتی ہے مری روز سحر
میرے جذبات مچلتے ہی چلے جاتے ہیں
بولتی آنکھیں مجھے تکتی ہیں حیرت سے، مگر
میں چلا جاتا ہوں جس پر بلا سوچے سمجھے
کس نئے موڑ پہ لے جائے گی یہ راہ گزر؟
تجھ کو چاہا ہے جو اس دور میں اے جانِ جہاں
جان بھی جائے تو ممکن نہیں اب اس سے مفر
مل کے اِک بار، نہ ملنے کی اگر کھائی قسم
کس طرح ہوں گے بھلا پھر مرے دن رات بسر؟
تو ہے محور مرے اشعار کی، لازم ہے تجھے
اے مری جانِ غزل! صرف مرے دل میں اُتر!
کاش وہ حسن دل آویز ہو، میرا ناصرؔ
کٹ سکے کچھ تو سہولت سے یہ دشوار سفر

بہر جانب نظر رکھے ہوئے ہیں
زمانے کی خبر رکھے ہوئے ہیں
تمہارے وصل کا گلرنگ موسم
سر شاخِ شجر رکھے ہوئے ہیں
نہ اُڑ جائے کہیں دل کا پرندہ
مقید بال و پر رکھے ہوئے ہیں
مہ و خورشید بھی ہیں دسترس میں
ستارے باندھ کر رکھے ہوئے ہیں
اگرچہ تیرگی در تیرگی ہے
پر اُمید سحر رکھے ہوئے ہیں
تمہارے دل تلک پہنچائے شاید
الگ اک رہگذر رکھے ہوئے ہیں
پرانی یاد اور تصویر جاناں
یہی رختِ سفر رکھے ہوئے ہیں
نہیں ہے کوئی بھی اپنا ٹھکانہ
کسی کے گھر میں گھر رکھے ہوئے ہیں
وصالِ یار کی اُمید پھر سے
سمجھ کر سوچ کر رکھے ہوئے ہیں
حصولِ زر کا سارا بوجھ ناصرؔ
قلم کی نوک پر رکھے ہوئے ہیں

سانس گن رہے ہیں ہم چارہ گر کے آنے تک
اِک خبر نہ بن جائیں، بے خبر کے آنے تک
طورِ جاں پہ چمکا ہے شعلہ رُخِ جاناں
جانے کیا گزرتی ہے اب سحر کے آنے تک
رونقیں ہیں ہر جانب، دم قدم سے انساں کے
ورنہ کیا تھا دُنیا میں اِک بشر کے آنے تک
شاعری میں لازم ہے زانوئے تلمذ بھی
معتبر ہے کب کوئی اس ہنر کے آنے تک
عشق کے سفر پر تھا، میں رواں دواں ناصرؔ
پاؤں میں پڑے چھالے بام و در کے آنے تک

دکھائی دینے لگا۔ بٹی خوش باپ مگن میرے دل میں جلن اور دماغ میں اُلجھن گھیر گھوٹ کر مجھے اس مقام پر لے آئی کہ میں کوئی دل بھاتا فیصلہ کروں۔ ہمت کر کے عینی کے دروازے کو جا کھٹکھٹایا۔ سمجھایا......لیکن مجھے حقیقت میں مجبور دکھائی دی اس لیے نہیں کہ وہ اپنے شریک سفر سے الگ رہ رہی ہے بلکہ اس لیے کہ باپ کے بغیر بچوں کی نگہداشت کرنا شاید اُس کے بس کی بات نہیں رہی۔

اپنے گھر والوں سے ڈری سہمی عینی واپسی کی لکیر کو پھلانگنا چاہے بھی تو کئی برزخ دیس کی قانونی اور شرعی مجبوریاں آڑے آ جاتی ہیں۔ دولت، پیسہ ایک گھر کو کھا گیا۔ کسی نے نہیں سوچا چار بچے ہیں اُن کے ماں باپ کو چھین لے گیا کسی کی آنکھ نہیں بھری۔ الگ الگ بچوں کو پالتے۔ گھوڑا گھوڑی بنتے ماں باپ کیوں اتنے ناسمجھ ہوئے کہ اپنے گلشن کو اپنے ہاتھوں سے پھونک ڈالا۔ اب یہاں گھر کا کوئی بڑا بزرگ نہیں ہے جو اس بکھرتے سنسار کو دوبارہ جوڑ سکے۔ کل کو بچے ایک بیمار ماحول میں پلے بڑھیں گے اور پرسوں من پسند راستوں کو سلامی دیتے ماں باپ کا نام روشن کریں گے۔ یہ ہماری بھول نہیں تو اور کیا ہے کہ پھول جیسے بچوں کو جدائی وفراق کے گلابوں میں لپیٹے کانٹوں سے لہولہان کرتے رہیں۔ ان معصوموں کی سوچ کا نعم البدل کیا ہو سکتا ہے۔ دیس والو پردیس کا دُکھ تمہارے ہزار سکوں پر بھاری نکلتا ہے۔

خوشی سے گھوڑا ہر کوئی بنتا ہے لیکن ٹوٹے دل اور اُجڑے گھر کا کوچوان کس کرب سے یہ الفاظ ادا کرتا ہے اگر آپ میں سے کوئی سنتا تو بلک بلک جاتا چھلک چھلک پڑتا۔ چند دنوں کی بات ہے علیحدگی کا فیصلہ آ جائے گا عینی کسی اور عاکف کی دلہن بنے گی اور عاکف اب دیس سے کوئی یتیم لاوارث عینی کو ڈھونڈنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اپنا فیصلہ کرنے میں آزاد ہیں۔ ہر دو فریقین سے مجھے بھی ایک فیصلہ چاہیے کہ تم اپنے ان بچوں کو کس طرح اپنے آپ سے چمٹاؤ گے۔ گھوڑا بن کر سواری کرواؤ گے۔ Buddy بن کر ان کے ساتھ کیسے کھیلو گے۔ ونڈر لینڈ، سفاری پارک، سی این ٹاور، نیاگرا فالز کیسے جاؤ گے۔

تم اپنے لیے ساتھی ڈھونڈنے میں کامیاب ضرور ہو جاؤ گے لیکن ان سے ان کے ماں باپ اُس روز نہیں چھنے تھے جب تم نے علیحدگی کا منڈپ سجایا تھا بلکہ اب تمہارے اس روگ کے بعد یہ حقیقی معنوں میں یتیم اور لاوارث ہوئے جا رہے ہیں۔ عاکف نہ تم کو کوئی فرق پڑے گا اور نہ عینی تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو خاص طور پر تمہارے چہیتے بھائی کو۔ یاد رکھو آج دُنیا بھر میں نفرت کا دور دورہ ہے۔ محبت مفقود ہوئی کسی دوسرے در پر ماتھا ٹیکنے سے بھی ڈرتی ہے۔ پیار کی کھیتی بغیر بیج کے کاشت نہیں ہوتی۔ انہیں مناسب دیکھ بھال، گوڈی چاکی، رکھوالی اور نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم ذرا سوچو ان بچوں کا کیا بنے گا۔ ہم پر ویسے ہی کئی شرعی عیب لاگو ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک مسلمان ہیں، پاکستانی ہیں۔ ان کے قوانین دکھاوے کے طور پر جانتے ہیں۔ بچوں کو اپنے انداز سے پالتے پوستے ہیں۔ پھر اگر آج ہم توقع کریں گے اس دیس کے باسی تمہارے بچوں کو گلے لگانے آگے آئیں گے تو بھول جاؤ کہ ایسا ممکن ہو سکے گا۔ کیونکہ جنت و دوزخ کے اس درمیانے مقام پر سنگل مدر اور سنگل فادر بننے کا رواج عام ہے۔ ہم جنس پرستی کا جن ہماری انسانی اقداروں کو کھائے جا رہا ہے۔ علیحدگی کا عفریت ہمارے گھروں کو نگلنے کے لیے بے تاب ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اپنی جنتِ ثانی بنانے نکلو تو دوزخ کی آگ اولاد کی آہیں بن کر تمہارے پیروں سے آن لپٹے۔ اُس وقت تم اپنے بچوں کو پیروں تلے نہیں دبا سکو گے۔ کیونکہ وہ خود اُس قابل ہو چکے ہوں گے کہ کسی کی جنت اور کسی کی راحت کو اپنے انداز سے پامال کر سکیں۔ اُنہیں یہ ورثے میں تمہاری طرف سے جدائی، ہجر اور نفاق کا سبق ملا ہے۔

فیصلہ کرنے سے پہلے اگر سوچ لیا جائے تو خاوند ساری عمر گھوڑا ہی بنا رہتا ہے۔ بیوی ذرا سی عقل استعمال کرے تو اپنے گھر کو غیروں کے بہکاوے میں نہ آ کر جلانے سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ تم دونوں نے ایسا نہیں کیا۔ تم اپنے اپنے اصطبل میں کھڑے ہنہناتے رہو۔ دیکھو تمہارے بچے کیا گل کھلاتے ہیں۔ ذہن نشین کر لو تم دونوں کبھی وہ سکھ حاصل نہیں کر پاؤ گے جو تم نے ان بچوں کی مناسبت سے پایا تھا۔ اب دکھوں کی کھیتی کاشت ہونے جا رہی ہے۔ میرے من سے ہوک نکلتی دم توڑتی، گلہ کرتی یہ سوال کر رہی کہ کیا ہم اس قدر مجبور ولاچار ہیں کہ ہم پر دنیا ہنسے اور ہم شرمندگی سے منہ چھپانے کی بجائے ڈھٹائی سے اتراتے پھریں۔

پی پیارا کا دیس کی بڑی کٹھن ہے گیل
کوئی کوئی سادھو چڑھ گیو بھیک جی سلجھا سلجھا بیل

ترجمہ: ''محبوبِ حقیقی تک پہنچنے کا راستہ بہت ہی دُشوار اور مشکل ہے۔ اے بھیک جی صرف سچی لگن والا درویش ہی اپنی منزلِ مراد تک پہنچتا ہے۔''

ایک سا رنگ، تماشا، ایک سا منظر نہیں
دھوپ چھاؤں ہے زمانہ ایک سے تیور نہیں
سہل مت جانو اسے، پختہ ہے یہ عہدِ وفا
ٹوٹ کر بکھرے گا جو یہ کانچ کا پیکر نہیں
اس قدر ماضی کے لمحوں کو نہ اب آواز دو
سوچ لو، یہ دل ہے سینے میں کوئی پتھر نہیں
دور رہتا ہوں، مگر قلب ونظر میں ہے ضیا
کون سا لمحہ ہے جس میں وہ رُخِ انور نہیں
کام لیتا ہوں میں گزرے وقت کے آثار سے
دل کی دھڑکن کو سمجھ لے جو وہ چارہ گر نہیں
زندگی میں جگمگاتا ہی رہے گا میرا فن
ڈوب جائے گا سحر کو رات کا اختر نہیں
وہ چمن زارِ محبت، وہ فضائے دلربا
بھول جاتا ہے کبھی گوہر، مگر اکثر نہیں

(گوہر ملسیانی)

روشنی آنکھ میں اُتر آئے
چاند چہرا اگر نظر آئے
کارفرما ہو صدق سوچوں میں
لفظ و معنی میں پھر اثر آئے
ہیچ ساماں نہ جسم و جاں ہو جائیں
سرخرو معرکے میں سر آئے
دوستی آبلوں سے اچھی ہے
کیا عجب راہ پُرخطر آئے
آبلہ پائی دشت و صحرا کی
ہو چکی، خیر، اب تو گھر آئے
راحتیں اُس کے پاؤں پڑی ہیں
آزمائش سے جو گزر آئے
خونچکاں سانحے ہیں متواتر
آنکھ ایسی ہے روز بھر آئے
دم بدم ہو ریاضؔ ضو افشاں
تیرگی زیر ہو، سحر آئے

(شناور اسحاق)

افسانے

پاپا گھوڑا بنتے ہیں

سعید اقبال میو (کینیڈا)

یہ عاکف اور عینی کی کہانی ہے۔ دو "ع" ملے تو دُنیا بھر کی راحتیں بن مانگی نعمتوں کی طرح نازل ہوئیں۔ مقبولیت کے زینے ہر کسی نے اپنے اپنے انداز سے طے کرنا ہوتے ہیں۔ گرچہ دُعاؤں کی شکل میں قبول ہونا اور پھر اُن کو دامن سے سمیٹ کر اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے بھی سامانِ رشک کی گٹھڑی کھولنا واقعی ایک بیش قیمت نایاب تحفہ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ پردیس کے دُکھ، دیس کے سکھوں کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔ تن تنہا بحر زندگی کی تلاطم خیز موجوں سے لڑنا پڑے تو انسان کی خفیہ صلاحتیں اُبھر کر بلکہ نکھر کر سامنے آتی ہیں۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا جب دیس کا عاکف پردیس کی عینی کا جیون ساتھی بنا۔ ایسی حسین جوڑی شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ کہنے کی حد تک نہیں بلکہ دیکھنے کی حد تک چاند اور چکور کا ملاپ۔ عینی سہاگن بنی سہاگ جوڑا پہنے اپنی اداؤں سے قلوپطرہ کو مات دے رہی تھی تو عاکف بھی خوابوں کے شہزادے کی مانند اپنی اس حور پری کو بانہوں کی قید میں سمیٹنے کے لیے صبر کا آخری جام پی رہا تھا۔ رات کا پچھلا پہر شروع ہوا۔ عہد و پیاں کے ساتھ رُخصتی ہوئی۔ لوگ جاتے جاتے کہہ رہے تھے خدا نظر بد سے محفوظ رکھے!

میرو پیا آیو ہے لین کو بھر بگلا کو بھیس
نینا رووال دل ہنسے میں چلی پیا کے دیس

ترجمہ: "میرے پیا مجھے بگلے کا بھیس بدل لینے کو آئے ہیں۔ رُخصتی کے وقت نینوں سے مصنوعی آنسو برس رہے ہیں۔ اندر سے دل پر قابو نہیں میں چلی پیا کے دیس!"

کیا معلوم کہنے اور دیکھنے والوں میں کسی کی نظر خیر بانٹتی اور کسی کی شر پکارتی ہے۔ نئی شادی شدہ جوڑے پر ملاپ کا خمار بن موسم کے بخار کی طرح اُترتا چڑھتا رہتا ہے۔ عاکف کی ماں بیٹے کی شادی کر کے واپس وطن کو لوٹ آئی اور نو بیاہتا جوڑا ہنی مون منانے جزائر غرب الہند کے ساحلوں کی طرف نکل گیا۔ اگر کسی کو سات سمندر پار بہترین ساتھی مل جائے تو میں ذاتی طور پر اس فرد کو خوش قسمت اور بختوں بھرا وہ درخت سمجھتا ہوں جس کی چھاؤں میں شاید کوئی نہ بیٹھے لیکن اس کی شاخیں اپنے پتوں کی ست رنگی ہر کسی پر نچھاور کرنے کو تیار ہوتی ہیں۔ سال گزرے آنگن میں بچوں کی کلکاریاں گونجنے لگیں۔ کاروبار زندگی کے ساتھ روزگار بھی بن مانگے برستا رہا۔ پیار بڑھتا بڑھتا بچوں کی آمد کے ساتھ گھٹنے جیسا لگنے لگا۔

عاکف اپنے گھر میں خوش اور بچوں کے ساتھ اتنا مگن تھا کہ اُسے کبھی پتہ نہ چل سکا کہ اُس کے ہرے بھرے شجر زندگی کی جڑوں کو کاٹنے والے کوئی اور نہیں بلکہ اس کے اپنے سسرالی ہیں۔ کہانی کچھ یوں شروع ہوتی ہے کہ عاکف کاروباری طور پر ایک خوشحال اور معاملہ فہم زیرک جوان تھا۔ آہستہ آہستہ بیوی نے اپنے گھر والوں کے بہکاوے میں آ کر اپنی جنت کے بہکاوے کو زچ کرنا شروع کر دیا۔ عینی کا نکھٹو بھائی جیجا کی کمائی پر پلنے والا، بڑھنے والا وہ اژدھا نکلا جو اس پورے خاندان کو لپیٹ گیا۔ تین پیارے بیٹے اور ننھی پری اپنے اپنے جھولوں میں لیٹے منتظر رہتے ہیں کہ اتوار کو ماں اور ہفتے کو روز باپ انہیں جھولا جھلائے گا۔ عاکف نے اپنے سسرال والوں کو نو سال تک خوب کھلایا پلایا اور نخرے اُٹھائے۔ بچوں کے ساتھ اُن کی ماں اور اپنی سابقہ بیوی کو دُنیا بھر کی آلائشیں اور آرائشیں بن مانگے لا دیں لیکن نجانے کسی کی نظر بد تھی جو اس گھر کو نگل گئی۔

پیسہ اور کاروبار عالم برزخ کے رہائشوں کے لیے فریقین کی علیحدگی کے بعد نصف نصف بٹ جاتے ہیں۔ دولت کی خاطر اپنی بیٹی کا گھر اُجاڑنے میں ماں نے بھی کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ بیوی اگر بیوی رہے تو خاوند کو ہمیشہ اپنے سحر سے جکڑے رکھنے کی صلاحیتوں سے مامور ہوتی ہے لیکن جب شادی کے بعد وہ دوبارہ بیوی سے بیٹی بننے کا سفر اختیار کرنے لگے تو سمجھ لیں ہنستے بستے گھر کو دوزخ کا نمونہ بنا ڈالے گی۔ بیٹیاں سدا بیٹیاں ہی رہتی ہیں لیکن اگر خاوند کے ساتھ بے وفائی و مکاری کا سبق دہرایا جائے تو پھر ان بدنصیبوں کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ خود اپنے ہاتھوں سے لگ جاتا ہے۔

عینی اور عاکف کا مقدمہ اب صلح کے تمام مراحل سے نکل کر بدنامی و رُسوائی کے دوراہے پر آن کھڑا ہے۔ لوگ دیکھتے اور ہنس کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ دونوں کے وکیل خطیر رقم لے کر اکٹھے کسی "Tim Horton" میں بیٹھے چسکیاں لے کر کافی پیتے اور کتنی تاریخیں آگے ڈالنی ہیں آپس میں طے کر لیتے ہیں۔ تمہارے فریق کی مالی حیثیت کیا ہے؟ اور کہاں تک نچوڑا جا سکتا ہے؟ اس دیس میں یہ عام ہے لیکن عام لوگوں کو چٹی چمڑی پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ ہوتا ہے جس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے دیسی کالے کوٹ پہننے کے قانون کے تاجر اُنہی کے نقش قدم پر چل نکلے ہیں۔ ایک محدود اندازے کے مطابق عاکف ابھی تک 80 ہزار ڈالر خرچ کر چکا ہے لیکن فیصلہ ہوتا ابھی دور دور تک نظر نہیں آتا۔ ہمارے اپنے بچوں کا گھر اُجڑ رہا ہے اور ہم خاموش تماشائی بنے سب کچھ ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ یہ مجبوری اور یہ بے بسی کی انتہا نہیں تو اور کیا ہے۔

عاکف نے ہر طرح کوشش کر دیکھی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ عینی اپنی غلطی پر پچھتا رہی ہے کہ اُس نے علیحدگی کا کیس کر کے کوئی اچھا قدم نہیں اُٹھایا۔ اپنے دعویٰ میں الزامات لگاتی ہے کہ یہ بچوں کا باپ نہیں (Buddy) دوست ہے۔ اُن کے ساتھ سارا دن گیمز کھیلتا رہتا ہے۔ ہفتے میں ساتوں دن کام کرتا ہے۔ گندی جرابوں کی بو گھر کو بدبودار بناتی ہیں بچوں کو باہر سے کھانا نہیں کھلاتا وغیرہ وغیرہ۔ عاکف نے مجھے آ کر ساری بات بتائی میں نے سوچا کہ کوئی مشترکہ راہ نکالی جائے۔ پتہ چلا کہ تمام دروازے آئینی قفلوں سے مقفل ہیں اور جو انہیں کھولنا چاہے گا برادرِ نسبتی جو آج ۲۷ سال کا کڑیل جوان ہے اپنے بدمعاش ساتھیوں کے ہمراہ برے انداز سے پیش آئے گا۔

عاکف ہفتے کے روز بچوں کو گھر لے آتا ہے۔ کبھی کبھار باہر بھی لے جاتا گیمز کھیلتا اور کھلاتا رہتا ہے۔ ننھی شہزادی بالکل باپ کی کاپی ہے۔ وہ اُوپر کھڑکی زور زور سے پاپا کو پکار رہی تھی اور پاپا جو شیو بنانے میں مصروف تھا جھاگ بھرے منہ کو لے کر بیٹی کو بولتا ہے کہ آؤ "پاپا گھوڑا بنتے ہیں" یہ فقرہ کہتے وقت اُس کی آواز کرب کی وادی سے نکلی اُس گونج کی مانند لگی جسے سن کر چرند پرند اپنی اولادوں کو آنے والے خطرے سے بچانے کے لیے اپنے دامن میں چھپا لیتے ہیں۔ بچی نے بانہیں باپ کے گلے سے لٹکائیں اور پاپا گھوڑا بنے مرحوم جنرل ضیاءالحق کی مانند اپنی بیٹی کی خواہش پورا کرتا

اقبال اختر/کوپن ہیگن

تقدس کا دریچہ سا کھلا ہے   یہ سب تیری دُعاؤں کا صلہ ہے

محمد اقبال اختر کو اگر تلاشِ معاش کے سلسلے میں بیرونِ ملک قیام نہ کرنا پڑتا تو ان کے اندر تخلیقِ فن کا اتنا وفور ہے کہ آج وہ پاکستان کے اہم شعراء میں شمار ہوتے۔ مگر وطن سے دور رہ کر بھی انہوں نے جو غزلیں اور نظمیں تخلیق کی ہیں ان میں سے بعض کے ایک ایک لفظ میں ایک خوبصورت فن کار جھلملاتا نظر آ جاتا ہے۔ ان کا مجموعہ کلام اس حقیقت کا شاہد ہے کہ محمد اقبال اختر نہ صرف ایک سچے مسلمان اور ایک کھرے پاکستانی ہیں بلکہ اُس کے ساتھ ہی ایک بے حد حساس شاعر بھی ہیں۔ وہ اپنے جذبات میں اپنے مشاہدات کو آمیخت کر کے ایسی شاعری کر رہے ہیں جس کا مطالعہ اُردو شاعری کی مثبت روایات کی بازیافت کا لطف ہی نہیں دیتا بلکہ اس میں ایک نئے آہنگ اور ایک نئے رنگ کا ذائقہ بھی موجود ہے۔ (احمد ندیم قاسمی)

تھا اس کے عشق کا شعلۂ بے نوا مرے ساتھ
حسیں لبوں پہ وہ رنگِ حنا کھلا مرے ساتھ
وہ بوئے گُل کی طرح عمر بھر رہا مرے ساتھ
میں شہر چھوڑ کے نکلا تو وہ چلا مرے ساتھ
ہو یہ مکاں کہ جہاں، میں یہاں مسافر تھا
میں لامکاں کو چلا اور ہے خدا مرے ساتھ
زمیں کی نذر کیا جو تھا میرے دامن میں
حسین خوابوں کا اِک سلسلہ رہا مرے ساتھ
عجیب دشت ہے تنہائی اور سناٹا
رہا نہیں کوئی اِک یاد کے سوا مرے ساتھ
صبا نے گیت الاپے تری جدائی میں
خیال ہے، کوئی نغمہ سرا رہا مرے ساتھ
چراغ سا تھا مرا یارِ دلنشیں روشن
بس اس کی یاد کا جگنو رہا سدا مرے ساتھ

ابھی ترکِ تعلق کی عیاں تعزیر باقی ہے
کہانی کے کسی کردار کی تقصیر باقی ہے
جھلکتا ہے کہیں اِک عکس منظر کے چمکنے سے
ابھی آئینہ دل میں تری تصویر باقی ہے
مری آنکھوں میں ہیں آباد وہ رعنائیاں اب تک
مرے معصوم خوابوں کی ابھی تعبیر باقی ہے
نہیں باقی رہی عظمت مرے اجداد کی مجھ میں
بنائے دیدہ و دل میں مگر تاثیر باقی ہے
اندھیری رات کے آثار گہرے ہی سہی پھر بھی
سحر کے نور کی اختر کہیں تنویر باقی ہے

سوچتا ہوں کہ کائنات ہے کیا
مستقل کیا ہے بے ثبات ہے کیا
ہر طرف ہے بچھی بساطِ نشاط
غم کا محور بس اپنی ذات ہے کیا
ہے فنا سب کو، جس طرف دیکھو
ہر کوئی لقمۂ ممات ہے کیا
ہم کو ان سے عبث توقع ہے
کیا خبر اُن کو التفات ہے کیا
یہ کرشمے ہیں سب مرے رب کے
دن ہے کیا چیز اور رات ہے کیا
دھیرے دھیرے غروب ہو جانا
بس یہی ہے تو یہ حیات ہے کیا
مر کے سکھ سے لحد میں سوئیں گے
جیت کیا چیز اور مات ہے کیا
روزِ روشن کے بعد چاندنی رات
جلوۂ حسن کائنات ہے کیا

تقدس کا دریچہ سا کھلا ہے
یہ سب تیری دُعاؤں کا صلہ ہے
وفورِ شوق کا یہ مرحلہ ہے
کسی کے دل کا دل سے واسطہ ہے
زمیں کیونکر ہے گردش میں ازل سے
یہ ماہ و سال کا کیا سلسلہ ہے
تری یادوں کی خوشبو میں گھرا ہوں
گلوں کا اور چمن کا رابطہ ہے
نہیں ٹوٹا نشہ آنکھوں کی مے کا
جو گزرا ہے عجب وہ سانحہ ہے

یہ مہلت کچھ زیادہ تو نہیں ہے
بچھڑنے کو رواں یہ قافلہ ہے
پہنچ پائے نہ ہم شہرِ ہنر تک
بظاہر مختصر سا فاصلہ ہے

لوگ آپس میں رہے برہم بہت
"کڑھتے ہیں دن رات اس پر ہم بہت"
برسرِ پیکار ہیں خدشات سب
اب اکیلے رہ گئے ہیں ہم بہت
اِک گھٹن آب و ہوا میں ہے کہیں
صورتِ حالات ہے مبہم بہت
دل میں کھلتے ہوں اگر زخموں کے پھول
پیار اور شفقت بھی ہے مرہم بہت
ہر جگہ اختر ہیں کچھ شدت پسند
ہم، مزاجاً نرم خو، مدہم بہت

سوچوں سے خود کو اس نے مری ماورا کیا
شاہ رگ سے تھا قریب، حجاب آشنا کیا
تیرے سوا تھا کون مرا تیرے شہر میں
منہ پھیر کر چلا گیا تو نے یہ کیا کیا
پوشیدہ کائنات میں کون و مکاں کئی
پھر اپنی ذات ہی سے مجھے نارسا کیا
اب گونجتی ہے گنبدِ جاں میں مری صدا
اے یادِ یار تو نے مجھے بے نوا کیا
اُس کے لیے بہت سے ہیں وہم و گماں مجھے
"یہ دل نے کیا کیا کہ اسیر بلا کیا"

اشفاق حسین/کینیڈا

یہیں کہیں کوئی آواز دے رہا تھا مجھے
چلا تو سات سمندر کا سامنا تھا مجھے

اشفاق حسین کی شاعری اصلی تقاضوں کی شاعری ہے۔ آج زندگی کن راہوں سے گزر کر کہاں تک پہنچی ہے اور آج کا انسان اس کے بارے میں کس طرح سے سوچتا ہے۔ اس کے بیان کے لیے بڑا اسلیقہ درکار ہے۔ اشفاق حسین لفظوں کے مزاج کو بڑی اچھی طرح جانتے ہیں اور پہچانتے ہیں اور اسے فکر سے ہم آہنگ کرنا بھی جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلی نسل اور موجودہ نسل دونوں سے ان کے فکری زاویے مختلف ہیں۔ اشفاق حسین کا اپنا ایک نقطہ نظر ہے چیزوں کو دیکھنے کا۔ ان کی نظموں اور غزلوں کی پہلی قرأت میں ایک اُداسی اور غم کی زریں لہر کا احساس ہوسکتا ہے، لیکن اگر ہم ذرا سی توجہ دیں تو اس سے بھی رجائیت اور اُمید کی کرنیں پھوٹتی ہوئی محسوس ہوں گی۔ اشفاق حسین کی شاعری صرف اپنے عہد کی آواز نہیں بلکہ ترقی پسند، فکر اور جمالیاتی احساس کا نیا شعری استعارہ ہے جو الفاظ کو فن پارے میں تبدیل کرتی ہے۔ (پروفیسر شارب ردولوی)

زومنگ

دیکھوں جو آسماں سے، تو اتنی بڑی زمیں
اِتنی بڑی زمیں پہ، چھوٹا سا ایک شہر
چھوٹے سے ایک شہر میں، سڑکوں کا ایک جال
سڑکوں کے جال میں چھپی، ویران سی گلی
ویراں گلی کے موڑ پہ، تنہا سا اِک شجر
تنہا شجر کے سائے میں، چھوٹا سا اِک مکاں
چھوٹے سے اِک مکان میں، کچی زمیں کا صحن
کچی زمیں کے صحن میں، کھلتا ہوا گلاب
کھلتے ہوئے گلاب میں، مہکا ہوا بدن
مہکے ہوئے بدن میں، سمندر سا ایک دل
اُس دل کی وسعتوں میں کہیں کھوگیا ہوں میں
یوں ہے کہ اس زمیں سے بڑا ہوگیا ہوں میں

تیرے پہلو میں ترے دل کے قریں رہنا ہے
میری دنیا ہے یہی مجھ کو یہیں رہنا ہے
کام جو عمر رواں کا ہے اُسے کرنے دے
میری آنکھوں میں سدا تجھ کو حسیں رہنا ہے
دل کی جاگیر میں میرا بھی کوئی حصہ رکھ
میں بھی تیرا ہوں مجھے بھی تو کہیں رہنا ہے
آسماں سے کوئی اُترا نہ صحیفہ، نہ سہی
تو مرا دیں ہے مجھے صاحب دیں رہنا ہے
جیسے سب دیکھ رہے ہیں مجھے اس طرح نہ دیکھ
مجھ کو آنکھوں میں نہیں دل میں مکیں رہنا ہے
پھول مہکیں گے یونہی، چاند یونہی چمکے گا
تیرے ہوتے ہوئے منظر کو حسیں رہنا ہے
میں تری سلطنتِ حسن کا باشندہ ہوں
اب مجھے اور کہیں جا کے نہیں رہنا ہے

ہنگامِ شب و روز میں اُلجھا ہوا کیوں ہوں
دریا ہوں، تو پھر راہ میں ٹھہرا ہوا کیوں ہوں
کیوں میری جڑیں جا کے زمیں سے نہیں ملتیں
گملے کی طرح صحن میں رکھا ہوا کیوں ہوں
اس گھر کے مکینوں کا رویہ بھی تو دیکھوں
تزئین در و بام میں کھویا ہوا کیوں ہوں
گرتی نہیں کیوں مجھ پہ کسی زخم کی شبنم
میں قافلہ درد سے بچھڑا ہوا کیوں ہوں
آنکھوں پہ جو اُترا، نہ ہوا دل پہ جو تحریر
اُس خواب کی تعبیر سے سہا ہوا کیوں ہوں
دن بھر کے جھمیلوں سے بچا لایا تھا خود کو
شام آتے ہی اشفاق میں ٹوٹا ہوا کیوں ہوں

یہیں کہیں کوئی آواز دے رہا تھا مجھے
چلا تو سات سمندر کا سامنا تھا مجھے
میں اپنی پیاس میں کھویا رہا خبر نہ ہوئی
قدم قدم پہ وہ دریا پکارتا تھا مجھے
زمانے بعد اُن آنکھوں میں اِک سوال سا تھا
کہ ایک بار پلٹ کر تو دیکھنا تھا مجھے
یہ پاؤں رُک گئے کیوں بے نشان منزل پر
یہاں سے اِک نیا رستہ نکالنا تھا مجھے
یہ زندگی جو ترے نام سے عبارت تھی
اسے کچھ اور بنانا سنوارنا تھا مجھے
رفیق گردشِ سیارگاں سے پوچھوں گا
وہ کون تھا جو خلاؤں میں ڈھونڈتا تھا مجھے
تمام ترکِ مراسم کے باوجود اشفاق
وہ زیر لب ہی سہی گنگنا رہا تھا مجھے

جزیرے کی طرح میری نشانی کس لیے ہے
مرے چاروں طرف پانی ہی پانی کس لیے ہے
میں اکثر سوچتا ہوں دل کی گہرائی میں جا کر
زمیں پر ایک چادر آسمانی کس لیے ہے
بظاہر پرسکوں اور دل کی ہر اِک رگ سلامت
تو زیر سطح دریا، اِک روانی کس لیے ہے
میں ٹوٹا ہوں تو اپنی کرچیاں بھی جوڑ لوں گا
بکھرنے پر مرے یہ شادمانی کس لیے ہے
یہ دل، بے حوصلہ دل، میرے کہنے میں نہیں جب
تو اپنے دل کی میں نے بات مانی کس لیے ہے
کریں لہجے بدل کر گفتگو اِک دوسرے سے
ہمارے درمیاں یہ بے زبانی کس لیے ہے
سبھی کردار اپنا کام پورا کر چکے ہیں
تو آخر نامکمل یہ کہانی کس لیے ہے

شکیل سروش/امریکہ

کبھی کبھار ترے ساتھ باتوں باتوں میں
ہم اتنا ہنستے کہ رونا بھی بھول جاتے تھے

شکیل سروش طویل عرصہ سے امریکہ میں مقیم ہیں۔اس لیے لاشعوری طور پر اُن کی شاعری یں وطن، ہجرت، گھر اور مسافرت کے مضامین کا وفور ہے۔اُن کے مصرعوں میں ایک درد کی لہر سر اُٹھاتی ہے۔اُن کا شعر ٹمٹماتے ہوئے دیے کی لو کی طرح اذیت کا ترجمان ہونے کے باوجود روشنی کی علامت ہوتا ہے۔اُن کی غزل آج کی غزل ہے جس میں زندگی کا حسن بھی ہے اور اُس کی تلخیاں بھی ہیں۔شکیل سروش کی شاعری دو ملکوں اور مختلف تہذیبوں سے پھوٹنے والی شاعری ہے جس کے خدوخال بیک وقت واضح بھی ہیں اور مخدوش بھی۔انہیں زندگی سے جو ملا ہے وہی انہوں نے نذرِ قارئین کیا ہے۔

زندگی اور موت کا یوں رابطہ رہ جائے گا
مقتلوں کو جانے والا راستہ رہ جائے گا
خشک ہو جائیں گی آنکھیں اور چھٹ جائے گا اَبر
زخم دل ویسے کا ویسا ہی ہرا رہ جائے گا
بجھ چکی ہوں گی تمہارے اپنے گھر کی مشعلیں
اور تُو لوگوں میں شمعیں بانٹتا رہ جائے گا
ساتھ لے جائے گا اِک اِک چیز وہ جاتے ہوئے
لیکن اس کا نام آنکھوں میں لکھا رہ جائے گا
پھول میں موجود رہنے سے ہے خوشبو کا وقار
پھول میں خوشبو نہیں ہوگی تو کیا رہ جائے گا
داستانِ عشق ایسی چھوڑ جاؤں گا سروش
وقت حیرانی سے مجھ کو دیکھتا رہ جائے گا

یہ پھول جو قبر پر اُگا ہے
انساں کے لہو کا اِرتقا رہ جائے گا
مقتل کی فضائیں رو رہی ہیں
یہ کون شہید ہو گیا ہے
راتوں کو وہ شخص بستیوں میں
کرنوں کے کھلونے بانٹتا ہے
ملتا ہے کبھی کبھار اب تو
وہ عید کا چاند ہو گیا ہے
ماتھے پہ ہے روشنی کا جھومر
ہونٹوں پہ گلاب کھل رہا ہے
کمروں میں لگے ہیں خس کے پردے
دل آگ میں پھر بھی جل رہا ہے

مرہم کی جگہ سروش ہم نے
زخموں پر نمک چھڑک دیا ہے

یا کھول دے سروں پہ ہواؤں کے سائباں
یا پھر سمیٹ لے مرے رستے کے سائباں
یا مجھ سے چھین لے مری آنکھوں کے سائباں
یا سونپ دے مجھے مرے خوابوں کے سائباں
سایوں میں ڈھل گئی ہے مصائب کی تیز دھوپ
جب سے ملے ہیں ماں! ترے قدموں کے سائباں
پھر کیوں وہ بو گیا تھا یہاں بیج سائے کے
جب کاٹنے ہی تھے اسے پیڑوں کے سائباں
چادر بنے ہوئے ہیں اُداسی کی قبر پر
اُس سے بچھڑ کے چاندنی راتوں کے سائباں
لوگوں نے کاٹ لیں جب اُداسی کی کھیتیاں
اُس وقت سر پہ آئے گھٹاؤں کے سائباں
ہم کو سروش ورثے میں کیا کچھ نہیں ملا
تنہائی، رات، کانپتی یادوں کے سائباں

پھولوں سے لوگوں کو مٹی میں ملا کر آئے گی
چل رہی ہے جو ہوا سب کچھ فنا کر جائے گی
زندگی گزرے گی مجھ کو روند کر پیروں تلے
موت لیکن مجھ کو سینے سے لگ کر جائے گی
وہ کسی کی یاد میں جلتی ہوئی شمع فراق
خود بھی پگھلے گی مری آنکھوں کو بھی پگھلائے گی

آنے والی موسموں کی سرپھری پاگل ہوا
ایک دن تیری جدائی کے ترانے گائے گی
آنے والا وقت بھی روئے گا میرے واسطے
آنے والے موسموں کو یاد میری آئے گی
اے مرے ساتھی یہ تیرے چھوڑ جانے کی کسک
مجھ کو دیمک کی طرح اندر ہی اندر کھائے گی
زندگی اِک بدچلن آوارہ لڑکی ہے سروش
دیکھ لینا ایک دن تجھ کو بھی یہ ٹھکرائے گی

سروش جن دنوں ہم اس کے ساتھ ہوتے تھے
ہوا کی آنکھوں میں خوشبو کے دیپ جلتے تھے
جو تیرے ساتھ گزارے وہ دن بھی کیسے تھے
زمیں پہ رہتے ہوئے آسماں پہ اُڑتے تھے
ہم اُنگلی تھام کے چلتے تھے جب بھی خوشبو کی
یہ پھول اور ستارے بھی رشک کرتے تھے
کبھی کبھار ترے ساتھ باتوں باتوں میں
ہم اتنا ہنستے کہ رونا بھی بھول جاتے تھے
ہمارا کوئی بھی دشمن نہ تھا زمانے میں
ہر ایک شخص سے ہم مسکرا کے ملتے تھے
مرے خلوص کے بدلے مری وفا کے عوض
سروش اُس نے اُداسی کے پھول بھیجے تھے

منصور آفاق/برطانیہ

وہ بات نہیں کرتا دشنام نہیں دیتا
کیا اس کی اجازت بھی اسلام نہیں دیتا

منصور آفاق جدید تر غزل کے نہایت منفرد شاعر ہیں۔ اُن کی شاعری نت نئے تجربات سے گزرتی رہتی ہے۔ اُنہوں نے طویل آزاد نظم میں عالم اسلام کا نوحہ لکھ کر اہل ادب کو چونکایا ہے۔ ''نیند کی نوٹ بک'' کی شاعری بھی پاکستان کے ادبی حلقوں میں زیر بحث رہی کہ انگریزی الفاظ کے شاعرانہ استعمال میں کیا امکانات ہیں۔ منصور کے اندر ایک بے چین روح ہے جو نہ تو خود اُن کو آرام سے بیٹھنے دیتی ہے اور نہ ہی فنونِ لطیفہ میں انہیں کسی مقام پر رُکنے دیتی ہے۔ وہ مختلف اصناف میں میدان مارتے رہتے ہیں اور پھر بے نیازی سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل شاعری اُن کی رومینٹک شاعری کی کتاب ''میں عشق میں ہوں'' سے لی گئی ہے۔ آج کل وہ برطانیہ میں مقیم ہیں۔

بارشوں کے موسموں میں پتلی ململ کی اسے
اچھی لگتی ہے ہری، پھولوں بھری، کرتی اُسے
ایک ہی بیڈروم میں رہتے ہوئے اتنا فراق
چوم لینا چاہیے اب تو زبردستی اسے
رفتہ رفتہ نیم عریاں ہوگئی کمرے میں رات
لگ رہی تھی آگ کی تصویر سے گرمی اسے
ایک بستر پر اکیلی کروٹیں اچھی نہیں
بھول جانی چاہیے وہ شام کی تلخی اُسے
اک پڑوسن دشمن جاں ہوتی جاتی تھی مری
بھیج دی تھی ڈاک میں زیتون کی ٹہنی اُسے

بہت اُداس بہت بے قرار رہتا ہے
مگر اُسی طرح دریا کے پار رہتا ہے
نہ کوئی نام نہ چہرہ نہ رابطہ نہ فراق
کسی کا پھر بھی مجھے انتظار رہتا ہے
مجھے اُداسیاں بچپن سے اچھی لگتی ہیں
خوشی ملے بھی تو دل سوگوار رہتا ہے
شبِ وصال ہی رہتی ہے میرے پہلو میں
خیال میں بھی کوئی ہم کنار رہتا ہے

محبت بھی عجب شے ہے

محبت بھی عجب شے ہے
یہ پتھر جیسے دل
پگھلا کے
آنکھوں سے بہا دینے پہ قادر ہے
محبت بھی عجب شے ہے
یہ پیلے خشک پتوں کے کناروں پہ بھی
گرتی اوس کے
قطروں کے اندر
چلتی رہتی ہے
یہ وہ ظالم ہے جو مہتاب میں ڈھل کر
سمندر کا بھی سینہ چیر دیتی ہے
مرا دل تو بہت ہی نرم و نازک تھا

یاد کے ویراں کدے سے

چوڑیوں کے ٹوٹے ٹکڑوں سے گری تنہائیاں
روشنی اِک بلب کی
چیزوں کی کچھ پرچھائیاں
رات کے کچھ ادھ جلے سگریٹ کے ٹکڑے فرش پر
خواب کچھ رکھے ہوئے بے خواب بستر کے قریب
وصل کی کافی کے دو آدھے پیالے میز پر
کچھ کتابیں، پنسلیں اور کچھ رسالے میز پر
یاد کے ویراں کدے میں اور تو کچھ بھی نہیں

ٹہل رہا تھا کوئی سنگ سنگ رنگوں کے
بدل رہے تھے تسلسل سے رنگ رنگوں کے
وہ آسمان پہ شامِ وصال پھرتی ہے
بچھے ہیں قوسِ قزح پہ پلنگ رنگوں کے
اُتر نہ جائے درختوں سے گل رتوں کی یہ شال
پہن لے کپڑے ذرا شوخ و شنگ رنگوں کے
تری گلی سے نکلتے نہیں ہیں جانِ بہار
فقیر عارضِ گل کے ملنگ رنگوں کے
تری مہک سے بڑھاتے ہیں اپنی توقیریں
میں جانتا ہوں سبھی رنگ ڈھنگ رنگوں کے

بہتی رہتی ہے گھٹا دیدۂ پرنم کی یونہی
اچھی لگتی ہے یہ برسات مجھے غم کی یونہی
کوئی امکان نہیں اس کے بچھڑ جانے کا
یاد آئی ہے مجھے ہجر کے موسم کی یونہی
پھر مجھے چھوڑ کے جانا تھا کسی نے شاید
رات آئی نہ تھی یہ ماہِ محرم کی یونہی
اپنی آنکھوں سے بنا لینے دو تصویر مجھے
پہنے رکھو ذرا پوشاک یہ ریشم کی یونہی
ذکر ہوتا رہے لیلائے وطن کا منصور
آگ جلتی رہے یہ نوحہ ماتم کی یونہی

طویل و تیرہ سہی شب مگر تسلی رکھ
ہے ساتھ ساتھ کوئی ہم سفر، تسلی رکھ
اُسے گزرنا انھی پتھروں سے ہے آخر
اے میری شوق بھری رہگذر، تسلی رکھ
ابھی سے صبحِ جدائی کا خوف کیا کرنا
ہے ماہ تاب ابھی بام پر، تسلی رکھ
کسی کا ساتھ گھڑی دو گھڑی بھی کافی ہے
اے زندگی کی رہِ مختصر تسلی رکھ

واجد امیر کا شمار جدید غزل کے معتبر شعراء میں ہوتا ہے۔ اُن کی غزل نے اہل ادب اور اہل فن کو چونکایا ہے اور آج کے نقاد کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ آوازوں کے ہجوم میں اُن کی آواز بہت منفرد اور دل پذیر ہے۔ اُن کی غزل کے موضوعات آفاقی اور فکری ہیں۔ خدا، تخلیق اور انسان کے حوالے سے اُن کی شاعری اپنے اندر بہت گہرائی اور پرتیں رکھتی ہے۔ وہ زندگی کا گہرا شعور اور ادراک رکھتے ہیں۔ اُن کی غزل ہمارے عہد کی نمائندہ غزل ہے۔ وہ گزشتہ تین دہائیوں سے شعر کہہ رہے ہیں۔ اُن کے تازہ شعری مجموعے ''زمین'' کو بہت اہم شعری مجموعہ قرار دیا جا رہا ہے۔ اس سے قبل اُن کا شعری مجموعہ ''خموشی کلام کرنا چاہتی ہے'' بھی اہل فن کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا چکا ہے۔ (ارژنگ)

بچتے کیا ہو میاں آن کے بازار کے بیچ
اور انا کاہے کو رکھ چھوڑی ہے بیوپار کے بیچ

اُس گھڑی عدل کی زنجیر کہاں ہوتی ہے
جب کنیزوں کو چنا جاتا ہے دیوار کے بیچ

شہر ہوتا ہے ستاروں کے لہو سے روشن
طشت میں سر بھی پڑے ہوتے ہیں دربار کے بیچ

کبھی اس راہ میں پھل پھول لگا کرتے تھے
اب لہو کاٹتے ہیں کابل و قندھار کے بیچ

کذب کے واسطے موجود ہے دُنیائے بہشت
سچ معلق ہے ابھی آتش و گلزار کے بیچ

راکھ بیٹھے گی تو پھر آگ روانہ ہوگی
جانے کب سے جو دہکتی رہی کہسار کے بیچ

شام اُترتی ہے تو واجد میں یہی سوچتا ہوں
آج کا دن بھی گیا یادوں کے انبار کے بیچ

وہ جس کے واسطے کاٹا گیا گھنا جنگل
پھر ایک روز وہی شہر بن گیا جنگل

ہزار اشک گرے پر نہ دل پسیج سکا
ذرا گری نہیں شبنم کہ کل اُٹھا جنگل

جو تھک کے بیٹھ گئیں تتلیاں اندھیرے میں
تو جگنوؤں نے سبھی جگمگا دیا جنگل

زمیں تک آتی کہاں تھی شعاع سورج کی
خزاں نے زرد کیا جب ہرا بھرا جنگل

ستارے ٹوٹ کے گرتے رہے خلاؤں میں
سنہرے چاند کی رہ دیکھتا رہا جنگل

پھر ایک دن کوئی شاخیں کترنے آ پہنچا
کسی کو راستہ دیتا نہ تھا ذرا جنگل

اب ایسے وقت میں اتنی خموشی کیا معنی
اسیر لوٹ کے آئے ہیں کچھ سنا جنگل

نہ کونوں کھدروں کی کھد بد پہ اُس کا دھیان گیا
جو ظلم ہوتے رہے دیکھتا رہا جنگل

جب اُس کی آنکھیں ہی واجد بجھا گیا سورج
کسی کو جاتے ہوئے کیسے دیکھتا جنگل

کس بات پہ بیٹھے سے اُٹھائے گئے ہم لوگ
کاغذ کے جزیرے پہ بسائے گئے ہم لوگ

تم کو تو وراثت میں ملی مسند شاہی
مقتل کی فصیلوں پہ سجائے گئے ہم لوگ

اِک شہر تماشا کو اُجاڑا گیا پہلے
پھر کوچہ و بازار میں لائے گئے ہم لوگ

جیسے کبھی سائے کی ضرورت نہ پڑے گی
اس طرح سے دوستوں سے ہٹائے گئے ہم لوگ

گھر کا وہی آنگن وہی خاموش در و بام
مدت سے کہیں بھی نہیں آئے گئے ہم لوگ

پہلے تو دُعاؤں سے ہواؤں کو بلایا
پھر لا کے منڈیروں پہ سجائے گئے ہم لوگ

دن رات کی کشتی میں بٹھایا گیا واجد
حالات کے دریا میں بہائے گئے ہم لوگ

رہتے ہیں بدن دُھوپ سے دوچار ہمارے
کس رُخ پہ بنے ہیں در و دیوار ہمارے

تم کو تو قبیلے کی حفاظت پہ رکھا تھا
اور تم کہ بنے بیٹھے ہو سردار ہمارے

اب اُن گلی کوچوں کو تو جانے کے نہیں ہم
دل پیچھے پڑا ہے یونہی بے کار ہمارے

جلدی تھی بڑی شوقِ سفر تیرا برا ہو
ساحل پہ پڑے رہ گئے پتوار ہمارے

منسوب ہیں کس عہد سے پہچان تو لو گے
مل جائیں جو تم کو کہیں آثار ہمارے

سمجھا دیے خود راستے دشمن کو وہاں کے
اپنے تھے جہاں برسر پیکار ہمارے

لیکن نہ گئی دل سے رہائی کی تمنا
پر کاٹے ہیں صیاد نے سو بار ہمارے

ہر لہر نئے رنگ میں ڈھال آتی ہے واجد
پانی پہ لکھے جیسے تھے کردار ہمارے

ایوب ندیم /لاہور

وہ اس طرح مرے تاریک دل میں اُترا ہے — کہ جیسے گنبد بے در میں چاند سا آئے

ایوب ندیم کی شاعری بالخصوص غزل کا اہم ترین وصف اس کا صوتی بہاؤ ہے۔ اس کی غزل میں کہیں کوئی ایسا لفظ، امیج، شعری ترکیب یا خیال اس وضع کا نمودار نہیں ہوا جو قرأت کی فطری روانی میں رخنہ انداز ہوا ہو۔ ایوب ندیم کی غزل تیرنا جانتی ہے اسی لیے اس میں پانی کے قدرتی بہاؤ سے ہم آہنگ ہونے کا انداز دیدنی ہے۔ ایوب ندیم کی غزل کا ایک اور وصف یہ ہے کہ جو آہنگ اور روانی اس کی لفظیات میں ہے، وہی اس میں پیش ہونے والے شعری تجربات میں بھی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تجربات کی تہذیب ہوگئی ہو اور ان کا کھردرا پن نرمی اور ملائمت میں ڈھل گیا ہو۔ اچھی غزل کے لیے ان دونوں اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔ (ڈاکٹر وزیر آغا)

صدائے کون و مکاں تھا تو بے صدا بھی تھا
رسا بھی تھا دلِ بے تاب، نارسا بھی تھا
وہ کوئی شخص تھا، احساس تھا کہ خوشبو تھا
جو میری ذات میں شامل تھا اور جدا بھی تھا
میں اُس سے اپنے تعلق کو نام کیا دیتا
وہ ساتھ ساتھ تھا میرے، گریز پا بھی تھا
جو آج اوڑھ کے سوتا ہے صبح کی چادر
کبھی وہ شام کی دہلیز پر کھڑا بھی تھا
نگل گیا اُسے سورج کا دیو آخرکار
وہ دل رُبا سا ستارہ جو رہ نما بھی تھا
ندیم ترکِ تعلق اُسی کی خواہش تھی
اُسی کی آنکھ میں اِک اشک جاگتا بھی تھا

کبھی تو خود سے بچھڑنے کا مرحلہ آئے
یہ راہ ختم ہو، اِک اور راستہ آئے
پگھل رہا ہوں میں احساس کی حرارت سے
کبھی تو روزنِ در سے خنک ہوا آئے
وہ اس طرح مرے تاریک دل میں اُترا ہے
کہ جیسے گنبد بے در میں چاند سا آئے
یہ میرے آخری سانسوں میں کس کی خوشبو ہے
مجھے یہ لگتا ہے شاید نہ اب قضا آئے
کبھی تو اوڑھ کے سوؤں میں بادلوں کی رِدا
کبھی تو میرے تصرف میں یہ خلا آئے
وہ آئے تو ہیں مرے پاس، پر دمِ آخر
سفینہ ڈوب رہا تھا کہ ناخدا آئے
کبھی کبھی تری یادوں سے یوں لرزتا ہوں
کہ جیسے کچے مکانوں میں زلزلہ آئے
بیان کیسے کروں اُس کی نازکی، ایوب
وہ پاؤں پھول پہ رکھے تو زخم سا آئے

انساں شکستہ پا ہوئے، سر ٹوٹتے گئے
نکلے حصارِ جسم سے، ڈر ٹوٹتے گئے
دل میں تھی تیری یاد، مگر لب سلے رہے
ہم لمحہ لمحہ شام و سحر ٹوٹتے گئے
صدیوں کے فاصلے بھی قدم چومنے لگے
ہم چل پڑے تو سنگِ سفر ٹوٹتے گئے
آخر ہماری ناؤ بھی ساحل پہ آ لگی
بنتے رہے بھنور پہ بھنور ٹوٹتے گئے
آلاتِ نو نے کاٹ دیں مزدور کی رگیں
کیا دور ہے کہ دستِ ہنر ٹوٹتے گئے
اب اعترافِ عظمتِ انسان یوں ہوا
ہم لوگ دربدر ہوئے، گھر ٹوٹتے گئے
وہ کون تھا جو راہیِ عرشِ بریں ہوا
ٹھوکر سے کس کی شمس و قمر ٹوٹتے گئے
وہ آندھیوں سا شخص، عجب شخص تھا ندیم
گزرا جہاں جہاں سے، شجر ٹوٹتے گئے

روز جینا ہے روز مرنا ہے
کتنا دشوار زیست کرنا ہے
خواب آنکھوں میں پھر سجانے ہیں
پھر نئے کرب سے گزرنا ہے
اِک دیا بام پر جلانا تھا
اِک دیا راستے میں دھرنا ہے
میں نے سورج کی جستجو کی ہے
راکھ ہو کر مجھے بکھرنا ہے
مجھ کو ہونا ہے پھر جدا تجھ سے
مجھ کو اِک بار اور مرنا ہے
عشق جب کر لیا ہے اے ایوب
اور کیا زندگی میں کرنا ہے

پیار وہ اور مرے دل میں بڑھا دیتا ہے
کبھی روتا ہے، کبھی مجھ کو رُلا دیتا ہے
کون آتا ہے مری آنکھوں میں جگنو لے کر
خواہشیں کون مرے دل میں جگا دیتا ہے
پہلے کرتا ہے بڑے ناز سے بے برگ و ثمر
پھر مری روح میں وہ پھول کھلا دیتا ہے
وہ مرا چاند مری آنکھوں سے اوجھل ہو کر
اِک ستارا مری پلکوں پہ سجا دیتا ہے
اُس کی ہر روز ملاقات سے ڈر لگتا ہے
روز ملتا ہے تو اِک زخم نیا دیتا ہے
اپنی قربت میں بھی رکھتا ہے وہ فرقت کی فضا
میرا اپنا ہی تو ہے، مجھ کو سزا دیتا ہے
آتشِ غم سے مرے دل کو جلاتا ہے ندیم
وہ عجب شخص ہے، شعلے کو ہوا دیتا ہے

عطا محمد خاں/لاہور

ہم نے خود اپنے ہاتھ سے اپنا ہر ایک شعر
اُس شہرِ سنگ داد کے ہونٹوں پہ لکھ دیا

کیپٹن عطا محمد خان کی شاعری پڑھتے ہوئے مجھے حیدر علی آتش یاد آئے، وہ غالب کی طرح ''سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری'' والے فخر کا صرف اظہار نہیں کرتے تھے بلکہ خود بھی ایک جواں ہمت سپاہی تھے۔ سپاہی جو مشکلات کے سامنے ہتھیار ڈالنا نہیں جانتا بلکہ کٹھن سے کٹھن حالات کا مقابلہ بھی پوری ہمت اور استقلال سے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کی مایوسی اور قنوطیت سے ''لبریز'' شاعری میں حیدر علی آتش اُمید اور حوصلہ مندی کی علامت بن کر اُبھرتے ہیں، یہی معاملہ اپنے کیپٹن عطا محمد خاں کا بھی ہے۔ بہت عرصے سے ہماری اُردو شاعری کا منظر نامہ ہی مایوسی اور ماتم کے نیلے پیلے اور سیاہ رنگوں سے عبارت ہے۔ اس فضا میں ہمیں ایک شاعر کی ضرورت تھی جو مشکلات کا سامنا خندہ پیشانی سے کرنے کی بات کرتا ہو اور جو ہمیں بتاتا ہو کہ زندگی صرف پھولو کی سیج نہیں، کانٹوں کا بستر بھی ہے اور اس کانٹوں کے بستر کو پھولوں کی سیج کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔ اگر یہ کام کوئی چھوٹا شاعر کرتا تو اس کی شاعری نعرے بازی کی شاعری بن کر رہ جاتی مگر عطا کے دست ہنر نے اس جذبے کو کومل لفظوں اور ان لفظوں کو صحیح مقام پر نگینوں کی طرح جڑنے کے عمل سے لازوال شاعری کی صورت میں ڈھال دیا ہے۔ محمد عطا محمد خاں کو ان کے خوبصورت جذبوں اور ان کی خوبصورت شاعری پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ (عطاالحق قاسمی)

دلوں کی برف میں اِک آگ سی لگاتا کون
جو ہم نہ ہوتے تو رودادِ غم سناتا کون
ہم آئے ہیں تو چراغاں ہوا ہے گلیوں میں
جو ہم نہ آتے تو یہ رونقیں بڑھاتا کوان!
چلے تھے سر کو اُٹھا کر ہم اپنے مقتل کو
جھکا کے سر کو جو چلتے، پلٹ کے آتا کون!
میں سوچتا ہوں زمیں پر نہ میں اُترتا اگر
تو داستانِ فلک کھول کر سناتا کون!
چراغ تھام کے میں نے اندھیرے قتل کیے
یہ میں نہ کرتا تو صیقل مجھے بناتا کون!
میں اِک سپاہی جو دشمن پہ فتح یاب ہوا
عطا میں جان نہ دیتا تو جاں لٹاتا کون!

ہم نے غمِ حیات کو پھولوں پہ لکھ دیا
سورج کا کرب موم کے چہروں پہ لکھ دیا
سر کی جگہ صلیب ہے شانوں کے درمیاں
یہ کس کا جرم کون سے ہاتھوں پہ لکھ دیا
اب کے برس بہار میں وہ آگ تھی کھلی
موسم نے میرے درد کو شاخوں پہ لکھ دیا
کر کے کشیدہ کاری لہو سے، مآلِ دل
خنجر کو کاٹتے ہوئے زخموں پہ لکھ دیا
ہم نے خود اپنے ہاتھ سے اپنا ہر ایک شعر
اُس شہرِ سنگ زاد کے ہونٹوں پہ لکھ دیا

اِک بے وفا کی یاد جو آئی تو اُس کا نام
زندان کی دہکتی سلاخوں پہ لکھ دیا
پہلے کیا ہے کانچ سے اس کو کشید، پھر
پتھر نژاد خواب کو آنکھوں پہ لکھ دیا
ہم نے عطا رگوں میں سمندر اُتار کر
سوکھی ہوئی زبان کو لہروں پہ لکھ دیا

اُڑتے ہوئے پرندوں کے پر کٹ کے گر گئے
ایسی ہوا چلی ہے کہ گھر کٹ کے گر گئے
اِک اجنبی دیار میں جب شام ڈھل گئی
پاؤں سے میرے لپٹے سفر کٹ کے گر گئے
جاری تھی جنگ دونوں قبیلوں کے درمیاں
جتنے بھی تھے کشیدہ وہ سر کٹ کے گر گئے
ممکن ہے آسمان بھی گر جائے ساتھ ہی
میرے بدن سے ہاتھ اگر کٹ کے گر گئے
مدت سے اس نگر میں جو بارش نہیں ہوئی
اشجار سے تمام ثمر کٹ کے گر گئے
میرے بدن کی کاٹ عطا تیز ہے بہت
چھو کر مرے بدن کو تبر کٹ کے گر گئے

کیا کیا جنوں نے پھول کھلائے سرِ قفس
دشمن نے تیر دل پہ چلائے سرِ قفس
اپنا نصیب ہے کہ قفس در قفس کھلا
اپنا مزاج تھا چلے آئے سرِ قفس

ہم نے ہر ایک چہرے کو پہچان کی عطا
ہم آئنے کو روبرو لائے سرِ قفس
سنگ آشنا خزاؤں میں ہم آئنہ مثال
رنگوں کے نقش دھوپ میں لائے سرِ قفس
آنکھوں میں جاگتے ہوئے شب ماندہ خواب ہیں
محو کلام ہم سے ہیں سائے سرِ قفس
ہم نے کلام لکھا ہے زنداں کی قید میں
یوں ماہتابِ ہم نے سجائے سرِ قفس
جب تک عطا رہینِ فصیلِ ستم رہے
لکھ لکھ کے گیت پیار کے گائے سرِ قفس

بدن پہ داغِ اسیری سجا لیا ہم نے
ترے قفس کو تو گھر ہی بنا لیا ہم نے
سرِ قفس تری یادوں سے معتبر ٹھہرا
وہ ایک غم جسے دل سے لگا لیا ہم نے
ہے ایک چاند کی صورت زمیں کے نقشے پر
مرا وطن جسے جنت بنا لیا ہم نے
غنیم دیکھ تری قید میں نہتے ہیں
غنیم دیکھ یہ غم بھی اُٹھا لیا ہم نے
بس ایک دل کا مسافر ہے ایک رُسوائی
اُڑا کے خاک تمنا کی کیا لیا ہم نے
عطا وہ راز ہے اور منکشف نہیں ہوتا
عطا یہ رازِ حقیقت کا پا لیا ہم نے

سیّد امتیاز احمد/لاہور

ہم لوگ صرف عشق ہی کرتے ہیں، چھوڑ دیں؟ چھوڑا، اور اب جو اتنی فراغت ہے کیا کریں

سیّد امتیاز احمد رونا بھی جانتا ہے اور رُلانا بھی۔ اسے شکوہ کرنا بھی آتا ہے اور شدتِ جذبات کی عکاسی بھی۔ مگر وہ تیسرا نخی ہے، جسے دیگر سخنوں سے آگے کی بات سوچنے کی قدرت عطا کی گئی ہے۔ اگر علم کی انتہا لاعلمی اور باخبری کی انتہا بے خبری ہے تو شاید جذبات کی انتہا بھی جذبات سے ماورا ہو جانا ہے۔ امتیاز کی دنیا بے جذبات نہیں بلکہ بالائے جذبات ہے۔ جذباتی اظہار کی ایک کہن، ایک ماڈرن، ایک نفیس تر صورت۔ اس دنیا میں کچھ وقت گزارا جائے تو احساس ہوگا کہ اللہ زبردست تو ہے مگر اپنی مخلوق کو زیردستی کے احساس سے دوچار نہیں کرتا۔ یہ اس عظیم ترین ذات کے اعجاز ہائے بے کراں میں سے ایک اعجاز ہے جس کی کچھ تشریح سیّد امتیاز احمد کی شاعری میں موجود ہے۔

گو یادِ میر جی کی نصیحت ہے کیا کریں
بے زور و زر ہیں اور محبت ہے کیا کریں
ہم لوگ صرف عشق ہی کرتے ہیں، چھوڑ دیں؟
چھوڑا، اور اب جو اتنی فراغت ہے کیا کریں
کم حوصلہ نہیں ترے جاں دادگاں مگر
اب زندہ رہنا بھی تو مصیبت ہے کیا کریں
آخر کو ہم نے دعویٰ فقر و غنا کیا
بے چارگی کا نام قناعت ہے کیا کریں
ہم جانتے ہیں ہم سے برا کوئی بھی نہیں
پر یہ جو ہم کو اچھوں سے نسبت ہے کیا کریں

گزر ہی جائے گی صاحب، گزارنی ہے اگر
عجیب بے سر و پا ہے یہ زندگی ہے اگر
یہ روز و شب کی اُداسی یہ دل کی ویرانی
ہمیں ہے سہل اسی میں تری خوشی ہے اگر
یہ کیا کہ اور کسی کام ہی کے ہم نہ رہیں
نگاہِ یار، نہیں، تجھ پہ آ پڑی ہے اگر
کبھی کبھی کے یہ دو چار حرفِ تلخ ہی کیا
تو کھل کے لڑ تو سہی ہم سے دشمنی ہے اگر
بتا تو دے ہمیں بے ربط گفتگو کا سبب
کہ رو تو لیں یہ ملاقات آخری ہے اگر

کسی نے کہہ جو دیا کچھ نہیں رہا باقی
ہمیں بھی ایسا لگا کچھ نہیں رہا باقی
وہ میرے دھیان کی گلیاں وہ میرے خواب کا شہر
چلی کچھ ایسی ہوا کچھ نہیں رہا باقی
ہمیں خبر نہ ہوئی اور بدل گئی دُنیا
ہمیں پتہ نہ چلا کچھ نہیں رہا باقی
تم آئے ہو میری دنیا سنوارنے کے لیے
مگر سنوارو گے کیا؟ کچھ نہیں رہا باقی
ہو اَب تو ختم اگر ہے یہ امتحان کوئی
مرے کریم خدا کچھ نہیں رہا باقی
بقا اسے بھی فقط واقعے کے دن تک ہے
اگر فنا کے سوا کچھ نہیں رہا باقی

تری تلاش میں گرتا بہ آسماں گئے ہم
بچھڑنے والے بہت دُور بھی کہاں گئے ہم
بہت سے دُکھ ہیں ازاں جملہ ایک یہ بھی ہے
کہ بے نشاں رہے اور بے نشاں گئے ہم
زمانہ چھوڑ کے ہم تیری سمت آئے تھے
تجھے یہ کیسے بتائیں کہ رائیگاں گئے ہم
ہوں لاکھ عیب و ہنر ہم میں، کم سخن تو نہ تھے
حضورِ یار ہی کچھ ایسے بے زباں گئے ہم
ہمیں جب اس نے کہا اُٹھ کے ہم چلے آئے
ہمیں جب اس نے بلایا کشاں کشاں گئے ہم
یہ اس کے فیصلے ہیں ان کی رمز وہ جانے
تمہیں یہ فتح مبارک ہو، دشمناں، گئے ہم

اب تو اتنی سی عنایت بھی نہیں مانگتے ہم
جا میاں تجھ سے محبت بھی نہیں مانگتے ہم
ایک دل ہے سو کبھی دھیان نہ آیا اس کا
ایک سر ہے کہ سلامت بھی نہیں مانگتے ہم
لیے پھر آبلہ پایاں کو جہاں جی چاہے!
ایسے مزدور ہیں اُجرت بھی نہیں مانگتے ہم
ہاں کبھی دیکھنا چاہی تھی محبت کی جھلک
اب اُن آنکھوں سے مروّت بھی نہیں مانگتے ہم
ہم نے لکھا بھی تو کیا اور نہ لکھا بھی تو کیا
شعر کا بدلہ لو شہرت بھی نہیں مانگتے ہم
کس لیے نام کی شاہی پہ خفا ہوتے ہیں
اب تو ان لوگوں سے بیعت بھی نہیں مانگتے ہم

لو پھر آئی صدا اُن راستوں کی
نہیں بھولی ہوا اُن راستوں کی
کبھی ہم نے دعا مانگی تھی، ہم کو
کرے مٹی خدا ان راستوں کی
اگر کوئی مسافر آئے پوچھیں
کہ اب صورت ہے کیا ان راستوں کی
وہاں کیا مجھ کو پہچانے گا کوئی
کہ میں تو گرد تھا ان راستوں کی
بہت سے رنج ہیں خوشیاں بہت سی
کوئی اِک ہے عطا ان راستوں کی

عمرانہ مشتاق مانی/لاہور

اس قدر ہوتی ہے محسوس تحفظ کی کمی
اپنے سائے سے بھی ہم لوگ ڈرے رہتے ہیں

عمرانہ مشتاق جانی پہچانی شاعرہ ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''ہجر کا عذاب'' اہل دل ونظر کے لطیف جذبات میں تموج پیدا کر چکا ہے اور اب دوسرا مجموعہ ''اماوس'' منظر عام پر آ رہا ہے۔ اس میں بھی وہی خصائص ہیں جو پہلے مجموعے کی پسندیدگی کا سبب بنے۔ عمرانہ کے اسلوب میں اشکال، ابہام اور پیچیدگی کی بجائے سادگی، آمد اور روانی جیسی خصوصیات موجود ہیں۔ وہ غرابت کی بجائے سلاست اظہار کی قائل ہیں۔ دقائق الفاظ اور طوالت تراکیب شعر کا بہت سا حسن چھپا لیتے ہیں۔ پسند عام کی خوشبو سے مہکتی ہوئی شاعری سب کو پسند آتی ہے اور بیشتر قارئین دل سے اس بات کو مانتے ہیں کہ شعر وہی اچھا جو دل سے نکلے اور دل پر اثر کرے۔ بنیادی طور پر عمرانہ کی شاعری لطیف جذباتِ انسانی کا اظہار کرتی ہے۔ چاہنے اور چاہے جانے کی فطری انسانی خواہش سے اس شاعری کا تارو پود تیار ہوا ہے۔ یہ آفاقی جذبہ ہے اور سبھی لوگ اپنی زندگیوں میں اسی قسم کے جذبات واحساسات سے دوچار رہتے ہیں اس لیے اس قسم کی شاعری کی ''اپیل'' بھی لامحدود ہوتی ہے۔ استاد شاعر کہا کرتے ہیں کہ شعراء اپنی شاعری کا آغاز بے ساختگی اظہار سے کرتے ہیں مگر جوں جوں فنی باریکیوں میں اُلجھتے جاتے ہیں تازگی اور روانی کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ مانی تازہ وارد ہیں اس لیے ان کے ہاں تو تکلفات پر ایک سیدھی بات کو ترجیح دینا فن کی اساس بن گیا ہے۔

وفا کے مرحلے اتنے کڑے ہیں
تری راہوں پہ پھر بھی چل رہے ہیں
وہ اظہارِ وفا کرتا نہیں ہے
جنوں کے مرحلے میرے لیے ہیں
بہت غمگین ہے پت جھڑ کا موسم
کہ دریا میری آنکھوں سے بہے ہیں
بھروسا کیا کریں اب زندگی کا
کہ ہم تو دوستوں سے ہی ڈسے ہیں
تمہاری یاد کے خوش رنگ تارے
فلک کی گود میں بکھرے پڑے ہیں
ہمارے دل کے نازک پھول مانی
بہاروں میں بھی مرجھانے لگے ہیں

آپ بھی اپنا مقدر دیکھئے
شہر بھر میں ہم سے بہتر دیکھئے
کلمہ حق پھر زباں پر لائیے
پہلے سب ہاتھوں میں پتھر دیکھئے
اب وفا کی آرزو مت کیجیے
بس جفا ہی کو مکرر دیکھئے
کس قدر ساکت ہے ساگر جان کا
ساحلوں پر کوئی کنکر دیکھئے
مانگ کر مانی دُعائے آخری
اپنی ناکامی کو اکثر دیکھئے

یہ اپنا دل ہمارے بس میں کب تھا
یہ تھا بسمل ہمارے بس میں کب تھا
جدائی کا سمندر موجزن تھا
کوئی ساحل ہمارے بس میں کب تھا
ہم اپنے آپ کو مرنے نہ دیتے
مگر قاتل ہمارے بس میں کب تھا
لکھا کر لائے صحراؤں کی گردش
کوئی محمل ہمارے بس میں کب تھا
سفر کی دُھوپ میں بچھڑا جو ہم سے
سرِ منزل ہمارے بس میں کب تھا
کسی چہرے پہ جو سجتا ہے مانی
وہی اِک تل ہمارے بس میں کب تھا

یاد کچھ رہتا نہیں یونہی پڑے رہتے ہیں
تیرے جانے سے کئی کام رُکے رہتے ہیں
میں کہ رہتی نہیں تنہائی میں اِک پل تنہا
کتنے آسیب مرے گھر میں بسے رہتے ہیں
بدحواسی بھی نہیں خوف کا امکاں بھی نہیں
یونہی چہرے کے مرے رنگ اُڑے رہتے ہیں
ہو خزاں رُت کہ بہار اس سے نہیں کوئی غرض
زخم ہر دور میں میرے تو ہرے رہتے ہیں
اس قدر ہوتی ہے محسوس تحفظ کی کمی
اپنے سائے سے بھی ہم لوگ ڈرے رہتے ہیں
اپنے اطراف کی کچھ تم بھی خبر لو مانی
آستینوں میں بھی کچھ سانپ چھپے رہتے ہیں

پروائیوں میں درد جو سوزِ نہاں کا ہے
لگتا ہے کوئی باب مری داستاں کا ہے
دل ٹوٹنے لگا غمِ دوراں کے بوجھ سے
اور سر الگ سے بوجھ میرے جسم وجاں کا ہے
تیرے اس التفات کو کیسے بیاں کروں
جنگل پہ کوئی سایہ جو ابرِ رواں کا ہے
رشتوں کی ہر مٹھاس میں تلخی سی آ گئی
یا پھر یہ ذائقہ مری اپنی زباں کا ہے
جاناں کے غم میں مانی مجھے کچھ پتہ نہیں
جانا کہاں ہے اور ارادہ کہاں کا ہے

بیچ منجدھار اُترنا اچھا
موج در موج اُبھرنا اچھا
اب ضرورت نہیں مرہم کی مجھے
درد کا حد سے گزرنا اچھا
خوف میں سہمے ہوئے شہر مرے
ایسے جینے سے تو مرنا اچھا
ہر طرف ناچ رہی ہے وحشت
ذکرِ اُمید نہ کرنا اچھا
قربتیں چند دہکتے لمحے
ایسی چاہت کا دم بھرنا اچھا
حرمتِ عشق پہ حرف آنے گا
مانی الزام نہ دھرنا، اچھا!

اسد رضوی/فرانس

ہم کو اس جنگ کے اسباب نہیں ہیں معلوم
ہم تو بس شوقِ شہادت میں چلے آئے ہیں

اسد رضوی کی غزلیات میں جمالیاتی پہلو بجا طور پر نمایاں ہے وہیں ان کی نظمیں بھی اپنے تاثر اور ندرتِ فکر کے سبب قاری کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لیے رکھتی ہیں۔ انہوں نے دیارِ غیر میں رہتے ہوئے اردو شاعری کی آبرو میں اضافہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہجرت کے احساسات میں گندھی ہوئی یہ شاعری اُن کی پہلی کتاب کی طرح عوام الناس میں پذیرائی حاصل کرے گی۔ (خالد شریف)

مست آنکھوں کی حراست میں چلے آئے ہیں
بے اماں لوگ حفاظت میں چلے آئے ہیں
یوں لگا ہم کو ترے دل میں اُتر کر جیسے
بادشہ اپنی ریاست میں چلے آئے ہیں
تختۂ دار پہ پہنچے ہیں تو اب سوچتے ہیں
ہم کہاں آپ کی چاہت میں چلے آئے ہیں
ہم کو اس جنگ کے اسباب نہیں ہیں معلوم
ہم تو بس شوقِ شہادت میں چلے آئے ہیں
اُس کی بانہوں میں پناہیں جو ملیں پہلی بار
یوں لگا جس طرح جنت میں چلے آئے ہیں
آلِ اطہارؑ سے لو جس نے لگا لی سمجھو
لوگ وہ سایۂ رحمت میں چلے آئے ہیں
میں اسد کوئی طلب گار نہ تھا فاقوں کا
یہ سبھی میری وراثت میں چلے آئے ہیں

سوچا ہی یہ کب تھا مری جاں اور کی ہوگی
اُلفت کبھی اُس دل میں نہاں اور کی ہوگی
یہ ترکِ مراسم کا جو پیغام ملا ہے
معلوم ہے مجھ کو کہ زباں اور کی ہوگی
میں خوب ہوں اُس شخص کے کردار سے واقف
کرتا ہے کہانی جو بیاں، اور کی ہوگی
اِس بار چرا لے گا کوئی میری بہاریں
اب کے مرے حصے میں خزاں اور کی ہوگی
اس بھول میں ہم لوگ گنوا بیٹھے ہیں اُس کو
میری ہی رہے گی وہ کہاں اور کی ہوگی
وہ وقت بھی آئے گا جوانی کے دنوں میں
دل میرا، مگر جائے اماں اور کی ہوگی
جو تیر چلا تجھ پہ اسد اور کا ہوگا
یاروں کے لبادے میں کماں اور کی ہوگی

بدن اگرچہ کیا میں نے ڈھیر دشمن کا
میں معتقد ہوں مگر اس دلیر دشمن کا
اب اپنے صبر کی حد ہو گئی جہاں والو!
بہت ہی جھیل چکے ہم اندھیر دشمن کا
مقابلہ ہے ہمیں دوستوں کے شر سے بھی
سرِ غرور بھی کرنا ہے زیر دشمن کا
یہ جنگی چال ہے فوجوں کو پیچھے لے جانا
نظر میں اپنے ہے سب ہیر پھیر دشمن کا
یہ وقت اُس کو نڈر کر ہی ڈالتا ہے اسد
جو سامنا کرے شام و سویر دشمن کا

چھوڑ دیں تجھ کو کہ پیاری کر لیں
آ کبھی رائے شماری کر لیں
کسی صورت نہ رہیں گھاٹے میں
ہم فقیروں سے جو یاری کر لیں
قتل دشمن بھی نہ یوں کر پائیں
جس طرح اپنے حواری کر لیں
عید سے زیادہ حسیں دن گزرے
دید جس روز تمہاری کر لیں
جب، جہاں چاہیں گلشن والے
نہر اِک خون کی جاری کر لیں
چھین لے جائیں وڈیرے ساری
فصل تیار جو ہاری کر لیں
فتح کرنے کو اسد دل اُس کا
ہم سعی آخری باری کر لیں

ہم حسینوں کی خبر رکھتے ہیں
مہ جبینوں کی خبر رکھتے ہیں
چاند تاروں پہ یہ بسنے والے
کب زمینوں کی خبر رکھتے ہیں
جانتے ہیں جو یہاں علمِ نجوم
سب کے سینوں کی خبر رکھتے ہی
بادشاہی ہو کہ درویشی، ہم
سب قرینوں کی خبر رکھتے ہیں
فرض کرتے ہیں ادا جو ساقی
آبگینوں کی خبر رکھتے ہیں
زر ہو، زن ہو یا زمیں ہو، اکثر
لوگ تینوں کی خبر رکھتے ہیں
شام میں ہو کہ اسد کوفے میں
سب لعینوں کی خبر رکھتے ہیں

نقش سورج میں جواں سال تمہارے دیکھوں
پھول کلیوں میں خدوخال تمہارے دیکھوں
آنکھ میں جیسے اُتر آئیں مرے سرخ گلاب
جب دہکتے ہوئے یہ گال تمہارے دیکھوں
دن پہ دیکھوں میں ترے چاند سے چہرے کا نکھار
رات پہ چھائے ہوئے بال تمہارے دیکھوں
دل گرفتہ ہوا مَیں ہجر میں جاناں جیسے
کاش ایسے نہ کبھی حال تمہارے دیکھوں
وقت ملتا ہے ملاقات کا کچھ روز اسد
راستے پھر مَیں کئی سال تمہارے دیکھوں

جعفر حسن مبارک/فیصل آباد

عدو کو پیش اپنے ہاتھ سے تلوار کرتا ہوں
محبت کے نئے کچھ زاویے تیار کرتا ہوں

جعفر حسن مبارک کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ نامور سفرنامہ نگار اور معروف شاعر ہیں۔ اُن کی سفرنامہ نگاری اور شاعری کے جہان منفرد موضوعات، نفسیات اور بنت کے باعث نہایت دلکش اور خوبصورت ہیں۔ وہ اُردو ادب کے اہم سفرنامہ نگار اور شاعر ہیں۔ اُن کا نام فیصل آباد کے ادبی حلقوں سے نکل کر اُردو کے بین الاقوامی ادبی حلقوں تک پہنچ چکا ہے۔ اُن کے متعدد شعری مجموعے اور سفرنامے شائع ہو چکے ہیں۔

ابھی کھلا نہیں باب تجلیات اے دل
بہت طویل ہے فرقت کی کالی رات اے دل
بس اِک نگاہ میں سب شہرِ خواب خاک پہ تھا
کسی کی آنکھ کے دیکھے ہیں معجزات اے دل
کبھی کبھی تو یہ تصویر خانۂ دُنیا
دکھائی دیتا ہے، نقش توہمات اے دل
خیالِ یار ہمہ وقت حرزِ جاں ہی رہا
تمام عمر گزاری ہے اس کے ساتھ اے دل
لہو لہو ہوئیں صدیوں کی اُنگلیاں لیکن
اُسی طرح سے ہے عقدۂ کائنات اے دل
ابھی تو خوشبو ہواؤں میں اس کی ہے جعفر
ابھی تو تھامے ہاتھوں میں اس کا ہاتھ اے دل

کبھی گردِ وقت کو ٹال کے تجھے دیکھنے کا خیال ہے
کبھی اپنی آنکھیں اُجال کے تجھے دیکھنے کا خیال ہے
ترے اُترے اُترے شباب سے مری خواہشیں کیوں گریز ہوں
یہ فریب ہیں مہ و سال کے تجھے دیکھنے کا خیال ہے
جو مرے بدن میں مثال خوں رواں دواں تیرا رُوپ ہے
لہو بام و در پہ اُچھال کے تجھے دیکھنے کا خیال ہے
وہی خواب خواب سی رہگزر وہی رنگ رنگ سی تتلیاں
وہی جھونکے بادِ شمال کے تجھے دیکھنے کا خیال ہے
پس آئینہ یوں کھڑا رہے تیرا حسن جیسے سراب ہو
کبھی آئینوں سے نکال کے تجھے دیکھنے کا خیال ہے

عدو کو پیش اپنے ہاتھ سے تلوار کرتا ہوں
محبت کے نئے کچھ زاویے تیار کرتا ہوں
بڑا طوفان گزرا ہے مگر ہمت نہیں ہاری
تری یادوں سے پھر دل کی زمیں ہموار کرتا ہوں
تری تکریم کی خاطر برہنہ پا نکل آیا!
تجھے بھی شاد کام آخر رہ پرخار کرتا ہوں
کسی حیلے سے بھی ایذا کی خواہش کم نہیں ہوتی
سو کارِ زیست کو دُشوار سے دُشوار کرتا ہوں
مجھے عادت نہیں ہو سکتی جعفر سہل کوشی کی!
میں ہر شب آنسوؤں کا ایک دریا پار کرتا ہوں

لمحہ آیا نہ کوئی عیش کا اُس رات کے بعد
تشنگی اور بڑھی موسم برسات کے بعد
کیا ہے؟ جو اُس کو نہ توفیق ہوئی آنے کی
یاد تو آتی رہی ترکِ ملاقات کے بعد
دُشمن آئے ہیں مداوائے غمِ جاں کرنے
یہی باقی تھا ستم، گردشِ حالات کے بعد
دُھوپ میں گیسوئے محبوب کی یاد آئی ہے
رات کی رانی مہکنے لگی ہے رات کے بعد
پھر ترے قدموں میں لوٹ آئے ہیں دل کے طائر
پھر یہیں خاک ہوئے، سیر مقامات کے بعد
طالبِ دید، خبر بھی ہے کہ اس محفل میں
پردۂ چشم بھی اُٹھا ہے حجابات کے بعد
میں نے اس ڈر سے نہیں مانگا کبھی کچھ جعفر
کچھ بھی دامن میں نہ بچتا تھا سوالات کے بعد

چاروں طرف کھلے ہوئے بازار ہیں بہت
یوسف نہیں ہے کوئی، خریدار ہیں بہت
کیا کیجیے کہ ایک ہی صورت ہے دید کی
حالانکہ ہم بھی خوابوں سے بیزار ہیں بہت
تیری خوشی کہ جلتے رہیں یوں ہی عمر بھر
ورنہ ہمیں تو یہ در و دیوار ہیں بہت
اے لطف نگہ یار کبھی اس طرف بھی آ!
ہم لوگ بھی تو جینے سے بیزار ہیں بہت
جعفر ہمیں بھی ہوش میں رہنا پڑے گا پھر
محفل میں آج اُن کے طرفدار ہیں بہت

جنید آزر/اسلام آباد

یوں ہی تو نہیں آیا میں افلاک سے اُٹھ کر — آواز کوئی دیتا رہا خاک سے اُٹھ کر

شعر گوئی کی ابتداء زمانہ طالب علمی میں ہی ہوگئی تھی۔ ۱۹۸۶ء میں ادبی سرگرمیوں کا آغاز اسلام آباد سے کیا۔ مختلف ادبی جرائد اور اخبارات میں کلام شائع ہونے لگا۔ غزل، نظم، حمد و نعت، ہائیکو اور دیگر اصناف میں طبع آزمائی۔ ۱۹۹۷ء میں بزم شعر و ادب اسلام آباد کے زیر اہتمام شائع ہونے والے انتخاب ''تصویر سخن'' میں ان کا کلام شامل اشاعت ہوا۔ اب تک دو شعری مجموعے ''کاغذ کی راکھ ۱۹۹۸ء'' اور ''اشارہ ۲۰۰۸ء'' شائع ہو چکے ہیں۔ ''اسلام آباد: ادبی روایت کے پچاس سال'' کے عنوان سے ایک دقیع تحقیقی مقالہ ''مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۲۰۱۰ء میں شائع کر چکا ہے جو اسلام آباد کی ادب تاریخ کے حوالے سے اپنی نوعیت کا اوّلین کام ہے۔ اس کے علاوہ بہت سا تحقیقی اور تنقیدی کام ابھی منتظر اشاعت ہے۔ اسلام آباد کی فعال ادبی تنظیموں، بزم جامِ ادب، بزم شعر و ادب، محفل نعت اور بزم حمد و نعت سے وابستگی رہی۔ برطانیہ سے جاری ہونے والے ماہنامہ ''آئینہ بریڈفورڈ'' کے مدیر رہ چکے ہیں۔ مختلف اخبارات کے ادبی ایڈیشن بھی کر چکے ہیں۔ بیرونِ ملک بھی عالمی مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ مختلف ٹی وی چینلز اور ریڈیوز پر مشاعرے پڑھ چکے ہیں۔

پیشوا ہو جو کوئی میرا ہوا سے آگے
چل پڑوں ملنے اُسے حد فنا سے آگے
ایسی خود رفتہ بھلا کب تھی سفر کی خواہش
جسم کب ایسے نکلتا تھا قبا سے آگے
رینگنے لگتے ہیں تلووں میں مرے رنج کئی
کوئی چلتا نہ ہو مجھ آبلہ پا سے آگے!
مجھ سے بڑھ کر تو نہیں دشتِ جنوں سے واقف
مجھ کو چلنے دو مرے راہ نما سے آگے
اب تو سینے کو میں صحرا سے بدل بیٹھا ہوں!
رقص وحشت ہو اگر میری بلا سے آگے
جب بھی آواز اُسے دیتا ہوں یہ ہوتا ہے
اُٹھ کے چل پڑتا ہوں خود اپنی صدا سے آگے
باندھ کے رکھوں کہاں خواہش خودسر اپنی
دوڑ جاتی ہے کہیں میری انا سے آگے
کوئی آسیب کہ لپٹا ہے طلب سے میری
کھینچ لیتا ہے مجھے خوفِ دُعا سے آگے
میری آنکھوں کے سمندر ہیں رواں تیرے لیے
آ کبھی میرے لیے دشتِ انا سے آگے
اب تو شکوہ بھی نہیں کرتا کسی سے اُس کا
جس کو کرتا تھا طلب اپنے خدا سے آگے
کتنی آنکھوں نے تجھے دیکھا تھا جانِ آزر
کس نے دیکھا تھا مرے رنگ جدا سے آگے؟

غرورِ ابروئے چشم ستم پہ زندہ ہوں
میں ایک خواب کے رحم و کرم پہ زندہ ہوں
یہ بات سبز جزیرے کہاں سمجھتے ہیں
میں ابر خشک سمندر کے نم پہ زندہ ہوں
اُڑائے پھرتا ہے گرد و غبار میرے نقوش
ہوائے تند! ترے دم قدم پہ زندہ ہوں
مجھے تو مار چکی دن کی مفلسی کب کا
خمارِ شب! ترے جاہ و حشم پہ زندہ ہوں
صدائے حرص! ترے زیر و بم پہ زندہ ہوں
وہ آنکھ بھی کہاں حاجت روائی کرتی ہے
میں اب جو زندہ ہوں اپنے ہی دم پہ زندہ ہوں
مرے بدن سے تری گونج ہی نہیں جاتی
یہ تیرا غم ہے اسی ایک غم پہ زندہ ہوں
میں جانتا ہوں محبت نہیں مرے بس میں
مگر میں پھر بھی اسی کے بھرم پہ زندہ ہوں

یوں ہی تو نہیں آیا میں افلاک سے اُٹھ کر
آواز کوئی دیتا رہا خاک سے اُٹھ کر
اُگتے ہیں مری آنکھ میں جس پل بھی ہرے پیڑ
اِک چہرہ چلا آتا ہے خاشاک سے اُٹھ کر
کیا جانئے کب ابر بنے اور برس جائے
اِک اشک مرے دیدۂ نمناک سے اُٹھ کر
تازہ ہیں میرے نقش ذرا دھیان سے چھونا
آیا ہوں تری سمت ابھی چاک سے اُٹھ کر
ہر چہرے میں دہراتا ہوں اِک چہرہ مسلسل
وہ نقش کہ جاتا نہیں ادراک سے اُٹھ کر
جو چاہو تو رنگوں کو ہی میراث سمجھ لو
خوشبو تو گئی اب گل صد چاک سے اُٹھ کر
پاؤں میں ترے ہجر کی زنجیر پڑی تھی
جائے بھی کہاں ہم تری املاک سے اُٹھ کر
ہم سادہ دلوں میں یہ کشش ہے کہ حسیں لوگ
تکتے ہیں ہمیں قریۂ چالاک سے اُٹھ کر
آہٹ ہی نہیں صحن بدن میں سو مرے دل
کچھ شور مچا لہجہ بے باک سے اُٹھ کر
وہ گردِ سفر تیری طلب میں جو ملی تھی
اب روح پہ آ بیٹھی ہے پوشاک سے اُٹھ کر
کس درجہ سرد تیرا رویہ ہے زندگی
یہ راز کھلا پہلوئے بے باک سے اُٹھ کر

نور کی ہر اُمید کو زندہ رکھتی ہے
ایک کرن خورشید کو زندہ رکھتی ہے
دن میری تصدیق میں حرفِ آخر ہے
رات مری تردید کو زندہ رکھتی ہے
روشن رہتی ہے میری آواز کی لو
جو حرفِ تائید کو زندہ رکھتی ہے
جانتا ہوں میں وصل کی آنے والی رُت
ہجر کی ہر تجدید کو زندہ رکھتی ہے
ایک روایت سانس لے میرے سینے میں
لمحہ لمحہ ڈوبتی صدیوں بوڑھی آنکھ
خوابوں کی تجرید کو زندہ رکھتی ہے
صحرا میں پھوٹے چشمے کی پہلی بوند
دریا کی تمہید کو زندہ رکھتی ہے
حد سے زیادہ ہو توصیف جو حرفوں کی
کب ذوقِ تنقید کو زندہ رکھتی ہے

عرفان صادق/لاہور

کیا خبر اُس کو بھڑکتا ہے کہاں شعلہ دل
وہ بھی انسان ہے کیا جس نے محبت نہیں کی

عرفان صادق نوجوان نسل کے مقبول شاعر ہیں۔ اُن کے تین شعری مجموعے اور متعدد انتخاب شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کی غزل ہمارے عہد کی غزل ہے جس میں غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ غمِ دوراں کا احوال بھی ملتا ہے۔ وہ زندگی کے مختلف موضوعات کو شعری اسلوب عطا کرتے ہیں۔ اُن کی غزلوں میں بڑے چست مصرعے اور بہت اچھے اشعار ہوتے ہیں۔ وہ ''ہم عصر انٹرنیشنل'' کے مدیر ہیں اور ''شیوا'' ادبی تنظیم کے تحت بہت سے مشاعرے کرا چکے ہیں۔ وہ ملک اور بیرونِ ملک کئی مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔

ضرورتوں کے کئی محاذوں پہ کٹ رہا تھا
میں ریزہ ریزہ بہت سے حصوں میں بٹ رہا تھا
بدن میں یک دم یہ پیاس کیسی سلگ اُٹھی ہے
یہ کون دریا مزاج مجھ سے لپٹ رہا تھا
میں ایک مدت سے ضبط کے پل صراط پر ہوں
کہ میری آنکھوں میں کوئی ساگر اُلٹ رہا تھا
کہ جیسے رنگوں کی قوس بننے لگی ہو مجھ میں
وہ دھیرے دھیرے یوں بازوؤں میں سمٹ رہا تھا
مری رگوں میں رواں دواں ہے عجیب نشہ
سخن سرائے سے جس گھڑی میں پلٹ رہا تھا
اذاں کی اُٹھنے لگی تھیں دل سے صدائیں عرفان
صدائے وہم وگماں سے جس دم میں اٹ رہا تھا

جلتے ہوئے دیے کے برابر سخن کرے
سرگوشیوں میں کون یہ شب بھر سخن کرے
حیرت کے کس مقام پہ ہوتا ہے اُس گھڑی
جب آئینے کے سامنے پتھر سخن کرے
رگڑیں تھیں میں نے دشت کے سینے پہ ایڑیاں
اب میری تشنگی سے سمندر سخن کرے
میں اُس سے ہم کلام ہوں ایسے کہ جس طرح
سورج کے ساتھ موم کا پیکر سخن کرے
باہر نکلتا ہی نہیں جو اپنے آپ سے
اُس کم سخن سے کیا دلِ مضطر سخن کرے

اک عجب خوف اُمڈ آتا ہے دروازوں سے
رات ہوتی ہے تو بھر جاتا ہوں آوازوں سے
میں کہاں اُس کے تصور پہ ہوں کھلنے والا
کیوں مجھے ناپتا رہتا ہے وہ اندازوں سے
درد کی آگ کبھی تال میں ڈھل جاتی ہے
روشنی پھوٹ نکلتی ہے کبھی سازوں سے
دو قدم آگے بڑھا کر نہیں ہٹنا پیچھے
عشق کا درس لیا جس نے بھی جانبازوں سے
جانتا ہوں کہ مرے پر بھی ہیں کٹنے والے
آسماں خوف زدہ ہے مری پروازوں سے
مرے اللہ کا احسان بہت ہے مجھ پر
مری آواز جدا رہتی ہے آوازوں سے

تیری ہر بات سنی دل کی حمایت نہیں کی
دیکھ لے اپنے موقف کی وضاحت نہیں کی
مری آنکھوں کی یہ حیرانی گواہی دے گی
خواب دفنائے ہیں لفظوں میں خیانت نہیں کی
کیا خبر اُس کو بھڑکتا ہے کہاں شعلہ دل
وہ بھی انسان ہے کیا جس نے محبت نہیں کی
یہ گماں تھا کہ بچھڑنا ہے تو مر جانا ہے
ظلم تو یہ ہے کہ سانسوں نے بغاوت نہیں کی
ایسے لگتا ہے کوئی بھول ہوئی ہے مجھ سے
جس سحر اُٹھ کے ترے غم کی تلاوت نہیں کی
قرض تھا قرض بھی آشفتہ سری کا عرفان
ہم نے یہ سوچ کے اس شہر سے ہجرت نہیں کی

خواب روشن نہ ہوئے نیند سہیلی نہ ہوئی
شاد آباد کبھی دل کی حویلی نہ ہوئی
اس کی یادوں کی مہک ساتھ لیے پھرتا ہوں
یہ مری سوچ کسی شام اکیلی نہ ہوئی
میں ترے دستِ سخاوت کو بھلا کیا کرتا
مرے آگے بھی کبھی مری ہتھیلی نہ ہوئی
جتنا بوجھو گے اسے اور اُلجھ جائے گی
زندگی جرم ہوئی کوئی پہیلی نہ ہوئی
جب تلک درد کے پاتال میں اُترے نہیں تھے
لفظ خوشبو نہ ہوئے سوچ چنبیلی نہ ہوئی
عمر بھر ہم نے جلائے ہیں اُمیدوں کے دِیے
پھر بھی روشن مری آنکھوں کی حویلی نہ ہوئی

بتاؤں کس طرح کتنا سوگوار آیا
عجیب ہجر ترے قرب میں گزار آیا
اب اس سے بڑھ کر تجھے اور مانتا کیسے
میں اپنے خواب تری آنکھ میں اُتار آیا
عجب ہوتی ہیں سرشاریاں محبت کی
کسی کی آنکھ میں ڈوبے تو اعتبار آیا
کسی نے ذکر کیا یونہی بے وفائی کا
مرے لبوں پہ ترا نام بار بار آیا
انا پرست جو اِک شخص مجھ میں رہتا تھا
کبھی کبھی تو یہ لگتا ہے اُس کو مار آیا
وہ جس کے ہوتے ہوئے سر اُٹھائے پھرتا تھا
اُسی کے سامنے سارا غرور ہار آیا
اُٹھائے پھرتے تھے سرسبز خواب آنکھوں میں
ہمارے حصے میں اُڑتا ہوا غبار آیا

ارشد ملک/راولپنڈی

ہر شب در آتی ہے دل میں یاد کوئی   ہر شب کوئی کھڑکی کھلی رہ جاتی ہے

ارشد ملک منفرد لہجے کے نہایت خوبصورت اور توانا شاعر ہیں۔اُن کے شعری مجموعے اور مرتب کردہ انتخاب ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہو چکے ہیں۔اُن کی مقبولیت روزافزوں ہے۔وہ اپنے مزاج کی طرح رومانوی شاعری پسند بھی کرتے ہیں اور لکھتے بھی ہیں۔اُن کی شاعری پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ محبت کو زندگی کا سب سے بڑا انقلاب سمجھتے ہیں اور اسی سے زندگی کے سارے مسائل حل کرنا چاہتے ہیں۔اُن کی شاعری محبتوں کے اظہار کا اعلیٰ نمونہ ہے۔(ارژنگ)

کرم اِک مہرباں کر دو مری چاہت امر کر دو
مرا دل پیار سے بھر دو مری چاہت امر کر دو
میں ساری عمر سجدہ تشکر میں بتا دوں گا
مرا اِک کام گر کر دو مری چاہت امر کر دو
مری پلکوں کو چھو لو تم حسیں یاقوت ہونٹوں سے
مرے آنسو گہر کر دو مری چاہت امر کر دو
چلو چھوڑو محبت میں گلے اچھے نہیں لگتے
یہ باتیں درگزر کر دو مری چاہت امر کر دو
نچھاور کر دو اپنے حسن کی سب چاندنی مجھ پر
مجھے رشکِ قمر کر دو مری چاہت امر کر دو
وہ کہتی ہے نہ پائل دو نہ کنگن دو نہ جھومر دو
مجھے چھوٹا سا اِک گھر دو مری چاہت امر کر دو
وہ کہتی ہے کہ ارشدؔ لمس کی خوشبو میں نہلا دو
رگِ جاں تک وفا بھر دو مری چاہت امر کر دو

تیری سانسوں میں گلابوں سی مہک لگتی ہے
حسن، جس رنگ میں ہو تیری جھلک لگتی ہے
شام ہوتے ہی نگاہوں میں اُتر آتے ہو
دل کی دھڑکن ترے پیروں کی دھمک لگتی ہے
اس لیے پھول میں کالر میں سجا لیتا ہوں
ان کی خوشبو ترے آنچل کی مہک لگتی ہے
جیسے گزرا ہو ابھی تو مرے دروازے سے
اب ہوا بھی تری پائل کی کھنک لگتی ہے
جانے کیوں وہ مری آنکھوں کو بھلا لگتا ہے
جس کے چہرے پہ ذرا تیری جھلک لگتی ہے
جس کی آواز مجھے حد سے بھلی لگتی تھی
اب وہ ہنسی ترے لہجے کی کسک لگتی ہے
جیسے گزرا ہو محبت کا جنازہ ارشدؔ
کتنی سنسان ترے گھر کی سڑک لگتی ہے

ہونٹوں پر اِک چپ سی جمی رہ جاتی ہے!
دل کی اکثر، دل میں دبی رہ جاتی ہے
لوگ بچھڑ جاتے ہیں اور تصویر اُن کی
آنکھوں میں تاعمر سجی رہ جاتی ہے
ہاتھ ہلا رہ جاتا ہے پھر صدیوں تک!
دروازے پر آنکھ ٹکی رہ جاتی ہے
ہر آسائش حاصل ہو جاتی ہے پر
زیست میں پھر بھی کوئی کمی رہ جاتی ہے
چاہے، وقت بدل دے سب حالات مگر
دل کے بکس میں یاد پڑی رہ جاتی ہے
ہو جاتا ہے رُخصت ہم سے پر اُس کی
سانسوں میں خوشبو سی بسی رہ جاتی ہے
قصہ گو، میرے گاؤں کے سچ کہتے تھے!
پیار کہانی درد بھری رہ جاتی ہے
ہر شب در آتی ہے دل میں یاد کوئی!
ہر شب کوئی کھڑکی کھلی رہ جاتی ہے

اُس کا چہرہ روبرو ہے آج کل
آنکھ ہر پل باوضو ہے آج کل
اِک طرف لاحق غم دنیا مجھے
اُس پہ تری جستجو ہے آج کل
تو ہی موضوعِ سخن ہے ہر طرف
بس تمہاری گفتگو ہے آج کل
جس نے تیرے نام کی تعظیم کی
بس وہی اِک سرخرو ہے آج کل
رنگ بکھرے ہیں مرے چاروں طرف
میں ہی میں ہوں تو ہی تو ہے آج کل
قطرہ قطرہ گر رہا ہے جس میں تو
آنکھ میری آب جو ہے آج کل
کر رہا ہوں کیوں اُسے ارشدؔ تلاش
وہ جو میرے چار سو ہے آج کل

ظاہر کسی صورت بھی کہیں نام نہ کرنا
ہیں لوگ بہت خاص ہمیں عام نہ کرنا
جانے کی اجازت تو دیے دیتے ہیں لیکن
رستے میں کہیں آتے ہوئے شام نہ کرنا
کچھ روز سے یہ حال ہے چاہت میں تمہاری
بیکار پڑے رہنا کوئی کام نہ کرنا
میں بھی نہ دکھاؤں گا سر راہ گریباں
تم بھی مرے وعدوں کو سرعام نہ کرنا
اس شرط پہ ہے ترکِ تعلق کی اجازت
بدنام زمانے میں مرا نام نہ کرنا
ہم لوگ پلٹ آنے کی خاطر نہیں جاتے
وا شام کے بعد اپنے در و بام نہ کرنا
یادوں کا نشہ ہوش اُڑا دیتا ہے ارشدؔ
ساقی سے کہو سامنے اب جام نہ کرنا

اعجاز فانی/گوجرانوالہ

جن کو انسان پروتا ہے بہت اُلفت سے
ہائے وہ گل سر بازار بکھر جاتے ہیں

اعجاز فانی کی شاعری بھی ان کی ذات کی طرح بے مثال ہے۔ آپ کی شاعری کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ رسمی شاعری کے بالکل مقلد نہیں ہیں۔ آپ قدرت، فطرت اور حقیقت پر شاعری کو پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی شاعری بھی ان ہی چیزوں کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ اعجاز فانی کی شاعری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ پوری پوری غزل ایک ہی تخیل میں کہتے ہیں۔ اعجاز فانی معاشرے کے دکھ درد کو اپنا دُکھ درد سمجھتے ہیں۔ اعجاز فانی کی شاعری میں حقیقت نظر آتی ہے۔ وہ بناوٹی باتوں سے میلوں دور نظر آتے ہیں۔ حقیقت بھی ایسی جس سے کوئی شخص منہ نہیں موڑ سکتا۔ (عادل بادشاہ)

وفا کا چور کاسہ کر گیا ہے
کہانی کا خلاصہ کر گیا ہے
نہیں تھا دل نے ہونا کرچی کرچی
مگر اس کا دلاسہ کر گیا ہے
اسے آزاد مت کرنا غموں سے
وہ دائر استغاثہ کر گیا ہے
عجب تھی تشنگی اس کی نظر میں
سمندر کو بھی پیاسا کر گیا ہے
فنا کے بعد بھی جلتا رہوں گا
وہ غم اتنے اثاثہ کر گیا ہے
نہیں کر پائے گا کوئی بھی فانی
نبی کا جو نواسہ کر گیا ہے

جن نے چہرے بگاڑ رکھے ہیں
دل میں غم کے پہاڑ رکھے ہیں
تیری اُلفت کی آبرو کے لیے
اپنے ارماں اُجاڑ رکھے ہیں
آتش غم کے سرد رکھنے کو
چاک سینے کے پھاڑ رکھے ہیں
جذب کر لیں جو اشک پلکوں کے
دل میں ایسے دراڑ رکھے ہیں
جتنے گل ہیں چمن میں بکھرے ہوئے
سب بہاروں نے جھاڑ رکھے ہیں
ہر زمانے میں عشق نے فانی
سینکڑوں قیس تاڑ رکھے ہیں

دیکھ مجنون نہ بن بات سمجھ جا میری
مارنا پڑتا ہے من بات سمجھ جا میری
بستیاں پیار کی صیاد جلا دیتے ہیں
نوچ لیتے ہیں بدن بات سمجھ جا میری
تو فقط پھول ہے راہوں میں بکھر جائے گا
لٹ گئے لاکھ چمن بات سمجھ جا میری
یہ جو چہرے تجھے شاداب نظر آتے ہیں
راکھ ہیں ان کے بھی من بات سمجھ جا میری
کھال اُترے گی تری دار پہ چڑھنا ہوگا
چور ہو جائے گا تن بات سمجھ جا میری
عشق فانی ترا خاموش بھی ہو سکتا ہے
دل میں رکھ اُس کی لگن بات سمجھ جا میری

صحن گلشن میں جب میرا یار آ گیا
ہر شجر ہر کلی پر نکھار آ گیا
پھول کھلنے لگے لہلہائی ہوا
وہ تو لے کر خزاں میں بہار گیا
دل کو تھاما کسی نے کوئی گر پڑا
بزم فردوس کا شاہکار آ گیا
ہر طرف اس کی آمد کا چرچا ہوا
جو بھی بسمل تھا اس کو قرار آ گیا
ماہ انجم شفق اور قوسِ قزح
اس کو دیکھا تو سب پر خمار آ گیا
فانی آتا نہ تھا تیرے پہلو میں وہ
جب وہ آیا تو پھر بے شمار آ گیا

دامن گل میں ہی گلزار بکھر جاتے ہیں
آگ بجھتی ہے تو انگار بکھر جاتے ہیں
شمع جلتی ہے صدا ایک لحد میں لیکن
جل کے پروانے کئی بار بکھر جاتے ہیں
پاؤں اُٹھتے ہیں ترے کوچے کی جانب جب بھی
اپنی راہوں میں کئی خار بکھر جاتے ہیں
جن کو انسان پروتا ہے بہت اُلفت سے
ہائے وہ گل سر بازار بکھر جاتے ہیں
رات کے پچھلے پہر خون تمنا کی طرح
ہم تیری یاد میں اے یار بکھر جاتے ہیں
ہوگا اندازِ وفا اُن کا الگ ہی فانی
جن کی راہوں میں طلب گار بکھر جاتے ہیں

پھر فضا پر سکوت طاری ہے
آج مقتل میں کس کی باری ہے
کس کی آہوں سے جل گیا ہے شہر
کس دوانے نے چیخ ماری ہے
کس کو پھر داد نے پکارا ہے
کس نے شب جاگ کر گزاری ہے
کس کا ساتھی بچھڑ گیا کس سے
کیوں ہواؤں میں بے قراری ہے
جب سے دیکھی ہے کربلا میں نے
میری آنکھوں سے خون جاری ہے
یہ ہے انجامِ زندگی فانی
چار کاندھے ہیں اِک سواری ہے

راحیلہ رُباب/لاہور

بے اختیار کر کے مجھے حوصلہ نہ دے
وہ اختیار کیا جو کسی کام کا نہ ہو

راحیلہ رباب کی شاعری پڑھتے ہوئے میں نایاب راستوں پر اُڑتی ہوئی دُھول میں پھنس گیا مگر اس کی شاعری نے میرے دل میں ایسے پھول کھلائے کہ دُھول بھی مجھے اپنی اپنی سی لگی۔ ویرانیوں کو حیرانیوں میں بدلنا شاعری ہے۔ جگنوؤں کو پکڑنا کوئی معرکہ نہیں ان کو ٹمٹماتے ہوئے دیکھنا ایک تخلیقی عمل ہے۔ مجھے شیکسپیئر کی ایک لائن یاد آ رہی ہے وہ اپنے ایک کردار کے بارے میں کہتا ہے: ''وہ دکھائی بھی اچھی دیتی ہے اور سنائی بھی اچھی دیتی ہے۔'' راحیلہ رباب اچھی تخلیق کار ہے اور اپنا کلام جب خود پڑھ رہی ہو تو بات اور بھی اچھی ہو جاتی ہے۔ (ڈاکٹر محمد اجمل نیازی)

خزاں کی رُت بھی بنی ہے بہار کا موسم
بہت حسیں ہے ترے انتظار کا موسم
تمہاری یاد کی برکھا چلی ہے پھر اِک بار
لگا بدلنے دلِ بے قرار کا موسم
نکھر سکا نہ مرے روز و شب کا پیرہن
یہ اور بات کہ آیا نکھار کا موسم
یہ شاخِ دل پہ جو ماضی کی کونپلیں پھوٹیں
عروج پر ہے کہیں یادِ یار کا موسم
فلک پہ تیر رہے ہیں جو بادلوں کے ہجوم
اسی کو کہتے ہیں قول و قرار کا موسم
جو دل میں ہیں گلے شکوے لبوں پہ لے آئیں
گزر نہ جائے کہیں اعتبار کا موسم
کھلا نہ کوئی بھی غنچہ رباؔب حسرت کا
تو کیسے مان لوں اس کو بہار کا موسم

اب درمیاں ہمارے کوئی فاصلہ نہ ہو
ہم دونوں جب ملیں تو کوئی دوسرا نہ ہو
دل مانتا نہیں تو مرا ساتھ چھوڑ دے
اے دوست بات بات پہ مجھ سے خفا نہ ہو
ایسا نہ ہو کہ تجھ کو کہیں بھول جاؤں میں
ایسا نہ ہو کہ تجھ سے کبھی رابطہ نہ ہو
بے اختیار کر کے مجھے حوصلہ نہ دے
وہ اِقتدار کیا جو کسی کام کا نہ ہو
روزانہ پوچھتا ہے کہ لگتا ہوں کیسا میں
جیسے وہ آئینہ ہی کبھی دیکھتا نہ ہو
پھرتا ہے رات بھر جو کہیں دوستوں کے ساتھ
ممکن ہے اُس کے گھر میں کوئی پوچھتا نہ ہو
اس زندگی کا بس یہی مقصد ہوا ے رباؔب
بس یہ دُعا کرو کہ کسی کا برا نہ ہو

کیا کرے کوئی شکایت اُس کی
نغمہ صد رنگ محبت اُس کی
آخری سانس بھی گھٹ جائے اگر
لب کہے جائیں حکایت اُس کی
کیا ڈرائے گا غمِ عشق مجھے
میری آنکھوں میں ہے وحشت اُس کی
وہ مرے نام پہ زندہ ہے اگر
ہیں مرے سانس امانت اُس کی
تنگ دامن ہے زمانہ سارا
قامتِ حشر ہے وسعت اُس کی
چاند تارے ہیں نظر میں ادنیٰ
ذوقِ نظارا ہے صورت اُس کی
دیکھتی ہوں میں کھلی آنکھوں سے
ہر حسیں شے میں شباہت اُس کی
عارض و لب کی تمنا بہلی
آئی جب یاد شرارت اُس کی
روپ بدلے ہیں کئی تم نے رباؔب
دل سے نکلی کبھی حسرت اُس کی؟

لطف ہو یا عتاب ہو جائے
کچھ تو کارِ ثواب ہو جائے
جاں بلب میکدے میں ہم ہیں پڑے
کیوں نہ ساقی حساب ہو جائے
ہاتھ پھیلا کے دیکھ لوں شاید
کچھ اُدھر سے جواب ہو جائے
اوڑھ کر چل دیا ہے درد مرے
شاید اب آفتاب ہو جائے
اس کی محفل میں ہم رہے ایسے
گویا دریا حباب ہو جائے
جس کو چھوتی ہیں اُنگلیاں تیری
ایسا پانی شراب ہو جائے
اس کی یادوں کے لمحے عام نہیں
دشتِ دل بھی رباؔب ہو جائے

جب اُس نے گفتگو کے قرینے بدل لیے
جوشِ جنوں میں ہم نے بھی لہجے بدل لیے
بکھرا ہوا تھا شہر میں بارُود کا دُھواں
تنگ آ کے پنچھیوں نے ٹھکانے بدل لیے
کیا ظلم ہے کہ اپنے مفادات کے لیے
بازو بدل لیے کبھی کندھے بدل لیے
جس نے کہا تھا ساتھ چلیں گے تمام عمر
اُس نے بھی دیکھ کر مجھے رستے بدل لیے
پھر یوں ہوا کہ دل میں گرہ پڑ گئی رباؔب
پھر یوں ہوا کہ لوگوں نے لہجے بدل لیے

ایوب صابر/سعودی عرب

پتھر لگا رہا ہوں بہاؤ کے سامنے   بستی مری کھڑی ہے کٹاؤ کے سامنے

ایوب صابر ایک گداز دل رکھنے والا انسان ہے جس کے اندر ایک بھرپور زندگی کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں اور ان رنگوں کے شیڈز اس کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ یہ دُکھ اور خوشیوں کے رنگ ہیں جن سے زندگی کی خوبصورتیاں جڑی ہوئی ہیں۔ شاعری تو بہت سے لوگ کر رہے ہوتے ہیں لیکن اچھی شاعری کم ہی لوگ کر رہے ہوتے ہیں۔ ایوب صابر بھی ان چند لوگوں میں سے ہے جن پر شعر اُترتا ہے اور یہ کسی بھی شاعر کے لیے نعمتِ عظمٰی سے کم نہیں۔ ایوب صابر کو کرافٹ پر بھی مکمل دسترس حاصل ہے۔ کسے کسائے چست مصرعوں اور اشعار سے اُن کی فنی ریاضت کا پتہ چلتا ہے۔ ایوب صابر کی غزل غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا حسین امتزاج ہے۔ زندگی کے موضوعات کا احاطہ کرتی ہوئی اس کی شاعری اُس کے مشاہدے، تجزیے اور تجربے کی نشاندہی کرتی ہے۔ وہ سعودی عرب میں مقیم ہے جسے ہم دیارِ غیر نہیں کہہ سکتے۔ وہ اپنا ہی دیار ہے بلکہ سب کا ہی دیار ہے۔ کیونکہ محسن انسانیت کی سرزمین ہے۔ دیارِ حبیبؐ میں بیٹھ کر لکھے جانے والے لفظ روشن روشن، مہکے مہکے اور پُرتاثیر نہ ہوں یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ (حسن عباسی)

میں تختِ سلیمان کہاں مانگ رہا ہوں
بس قوم سے احساسِ زیاں مانگ رہا ہوں

باقی ہے تپش، اب بھی مری شعلہ نوا میں
میں آگ سے تھوڑا سا دھواں مانگ رہا ہوں

ہر شخص کو دو وقت کی روٹی ہو میسر
مدت سے کوئی ایسا جہاں مانگ رہا ہوں

اس شب کے اندھیرے سے ابھی روشنی پھوٹے
میں وقتِ سحر حکمِ اذاں مانگ رہا ہوں

ہر اِک کو عطا ہوتی نہیں درد کی دولت
سفاک سے کیوں دردِ نہاں مانگ رہا ہوں

اب کون مرے ماضی کی روداد سنائے؟
قرطاس کے ملبے سے زباں مانگ رہا ہوں

برسوں سے کھڑا ایک زمیں بوس محل پر
کھنڈرات سے عظمت کا نشاں مانگ رہا ہوں

حیرانی سے پتھر ہی نہ ہو جائیں، یہ صابر
آنکھوں سے فقط اشکِ رواں مانگ رہا ہوں

کوئی غم خوار پیدا کر، کوئی ہم راز پیدا کر
تو اس خاموش بستی میں کوئی آواز پیدا کر

پرانے ہوگئے ہیں رستم و سہراب کے قصے
بہت جانبر یہاں پر ہیں، کوئی جانباز پیدا کر

زمانہ تیری جانب آج بھی حیرت سے دیکھے گا
صدی ہے یہ نئی اس میں نیا اعجاز پیدا کر

ارادے کی بلندی سے مسخر کر فضاؤں کو
کٹے ہیں پر مگر تو ہمتِ پرواز پیدا کر

کوئی تمغہ شجاعت کا نہیں خیرات میں ملتا
تو اپنے زورِ بازو سے کوئی اعزاز پیدا کر

اُٹھا زادِ سفر، سب راستے ہیں منتظر تیرے
چلی آئے گی منزل جنبشِ آغاز پیدا کر

یونہی کاغذ کے سینے پر لکیریں مت بنا صابر
زمینِ دل پہ جو اُترے وہی انداز پیدا کر

پتھر لگا رہا ہوں بہاؤ کے سامنے
بستی مری کھڑی ہے کٹاؤ کے سامنے

ثابت قدم رہا ہوں، ہر اِک امتحان میں
جھکتا نہیں کبھی میں دباؤ کے سامنے

ہر شخص ہوگا، آج بھی محفوظ دیکھنا
بے بس نہیں جو میں ترے داؤ کے سامنے

اے ناخدا، تجھے بھی خدا ہی بچائے گا
گرداب آ گیا تری ناؤ کے سامنے

چہرے سے لگ رہا ہے، مسافر تھکا ہوا
اِک شخص جو کھڑا ہے پڑاؤ کے سامنے

دیکھا نہیں ہے تو نے کبھی دوستوں کا وار
دُکھ تیرا کچھ نہیں مرے گھاؤ کے سامنے

اس آگ کو بجھانا تو صابر نہیں محال
آنسو مرے بہت ہیں، الاؤ کے سامنے

مجھ سے تو اصولوں کا ہی سودا نہیں ہوتا
خودداری کی اس جنس میں گھاٹا نہیں ہوتا

یہ حکمت و دانش بھی ہے انمول خزانہ
دولت ہے مگر چور کا کھٹکا نہیں ہوتا

حالات نے ہونٹوں پہ لگا رکھے ہیں تالے
ورنہ تو کوئی اتنا بھی گونگا نہیں ہوتا

گھر چھوڑنا پڑتا ہے، کبھی پیاس کی خاطر
آنگن میں کسی گھر کے بھی دریا نہیں ہوتا

اِک بزم سجا رکھی ہے، اس خانۂ دل میں
تنہائی میں رہ کر بھی میں تنہا نہیں ہوتا

دو بول محبت کے، مٹا دیتے ہیں گھاؤ
نفرت میں چھپا زخم کا چھالا نہیں ہوتا

صابر جو چھوا میں نے تو احساس ہوا ہے
ہر پھول کے پہلو میں تو کانٹا نہیں ہوتا

حُسن بانو/لاہور

یقیں غالب نہیں آتا گماں پر
تمہارے درد کو رکھوں کہاں پر

حسن بانو کواگر چہ شاعری کے گلزار میں قدم رکھے زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن اس مختصر مدت میں اُس نے بہت خوبصورت شاعری کر کے سامعین، قارئین اور ناقدین کو داد دینے پر مجبور کر دیا ہے۔ اساتذہ کی زمینوں میں باکمال غزلیں کہنے والی حسن بانو کی شاعری کے تیور ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ بہت جلد اُس مقام شعر تک پہنچنے والی ہیں جہاں کسی شاعر کو پہنچتے پہنچتے برسوں لگ جاتے ہیں۔ حسن بانو اچھی شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھی میزبان بھی ہیں۔ اُن کی میزبانی میں منعقد ہونے والا مشاعرہ نہایت منفرد اور دل پذیر ہوتا ہے نہ صرف شعراء کے لیے اعلیٰ کھانوں کا انتظام ہوتا ہے بلکہ بذریعہ قرعہ اندازی تحائف بھی پیش کیے جاتے ہیں۔

میں تو سمجھی تھی کہ بس میں ہوں اکیلی رُسوا
جب کیا غور تو نکلی ہے یہ دُنیا رُسوا
ایک مدت سے اسی سوچ میں گم رہتی ہوں
حُسن کتنا ہے یہاں عشق ہے کتنا رُسوا
جب سے چمکا ہے مرا ماہِ طلب ظلمت میں
اب نہیں شوقِ فلک پر کوئی تارا رُسوا
میں نے دیکھا ہے یہ نظارہ رُسوائی بھی
رات کے پچھلے پہر چاند کا چہرہ رُسوا
ہم سے عشاق کو رُسوائے جہاں کر کے حسنؔ
کبھی دریا ہوا رُسوا کبھی صحرا رُسوا

بہت دُشوار تھا رستہ وفا کا
بھرم پھر بھی سدا رکھا وفا کا
مجھے اب سانس بھی آتا نہیں ہے
لگا ہے زخم یوں گہرا وفا کا
مرے چہرے پہ تجھ کو پیار آئے
اگر تو دیکھ لے چہرہ وفا کا
محبت بین کرتی پھر رہی ہے
اُٹھا کر ہاتھ میں کتبہ وفا کا
گھڑی پل بے قراری سی ہے دل کو
لگا ہے جب سے یہ دھڑکا وفا کا
حسنؔ در بہ در سے پوچھ لینا
اُسے معلوم ہے رستہ وفا کا

اُس نے جب بھر لیا نگاہوں میں
آ گئی میں عجب پناہوں میں
جب سے وہ ہم سفر ہوا ہے مرا
پھول کھلنے لگے ہیں راہوں میں
بے خبر آدمی کو کیا معلوم
موت ہے زندگی کی بانہوں میں
بھیک لیتے ہیں ہم فقیروں سے
بیٹھ کے دیکھ بادشاہوں میں
کھینچ کر دار پر محبت کو
جشن برپا ہے قتل گاہوں میں
نیکیوں کی تلاش میں اے حسنؔ
ڈوب جانا پڑا گناہوں میں

وہ مرے دل پہ ایسے چھایا ہے
ہر نفس میں مرے سمایا ہے
کیسی برسات ہے فضاؤں میں
چاند کس جھیل میں نہایا ہے
جس کو آنکھیں پسند کرتی ہیں
دھڑکنوں میں بھی وہ سمایا ہے
میری پلکوں پہ اشک کیسے ہیں
آج یادوں میں کون آیا ہے
کیا خبر بے خبر زمانے کو
دھوپ میں کیوں دیا جلایا ہے
میرے جیسا کوئی بھی حسنؔ کبھی
کب زمانے کو راس آیا ہے

یقیں غالب نہیں آتا گماں پر
تمہارے درد کو رکھوں کہاں پر
ہزاروں زخم آئے دل کی جانب
بھروسہ جب کیا میں نے جہاں پر
میں رسوائے زمانہ ہو رہی ہوں
لگا کر اُڑ رہی ہے داستاں پر
تمہاری یاد نے کب دی رہائی
پڑے میرے قدم کب آسماں پر
لب خاموش کو اتنا بہت ہے
ہوئی ہوں میں بیاں تیرے بیاں پر
وہیں پر زندگی ٹھہری ہوئی ہے
وہ حسنؔ ذات بچھڑا تھا جہاں پر

افضل عباسی / صادق آباد

یہ دریچے سے جو پھولوں کی مہک آتی ہے
تیرے آنے کا اشارہ ہو ضروری تو نہیں

افضل عباسی کا شمار صادق آباد ضلع رحیم یار خاں کے ممتاز شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ سادہ اور آسان زبان میں شاعری کرتے ہیں۔ اُن کی غزل سہل ممتنع کا عمدہ نمونہ ہے۔ اُن کی شاعری میں غم جاناں سے لے کر غم دوراں تک موضوعات کی ایک کہکشاں بکھری ہوئی ہے۔ انہوں نے روایت سے استفادہ کر کے جدت میں قدم رکھا ہے۔ آج کل کے نوجوان شعراء کی طرح انہیں مجموعہ کلام شائع کرانے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ وہ مقدار کی نسبت معیار کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ ادبی تنظیم ''دستک'' کے صدر ہیں۔ دستک کے پلیٹ فارم سے انہوں نے چند یادگار آل پاکستان مشاعروں کا اہتمام بھی کیا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب اُن کی غزل کا اعتراف ملکی سطح پر بھی کیا جائے گا۔ (ارژنگ)

صبح گزری یا شام گزری ہے
اپنی تو تیرے نام گزری ہے
اب تو مطلب نہیں ہے اس سے بھی
خاص گزری یا عام گزری ہے
تھا حقیقی یا وہ مجازی تھا
ہاتھ میں لے کے جام گزری ہے
جو رہی یاد یار سے غافل
وہ گھڑی کتنی خام گزری ہے
حکمرانی تو کی بزرگوں نے
اپنی تو بس غلام گزری ہے
در و دیوار سے سہی افضل
عمر محو کلام گزری ہے

ایک ٹوٹا دیا ہے میرے پاس
شب کا کچھ آسرا ہے میرے پاس
عمر کانٹوں میں ہو گئی ہے بسر
اب کہیں گل کھلا ہے میرے پاس
رات، طوفان، پانیوں کا زور
صرف حرف دعا ہے میرے پاس
زیست مشکل ذرا زیادہ ہے
حوصلہ تو بڑا ہے میرے پاس
جب میرے لب پہ نعتؐ ہوتی ہے
ایسا لگتا ہے اب خدا ہے میرے پاس
حکمرانی کے ہوں قریب افضل
ایک سکہ بچا ہے میرے پاس

دو دلوں کو جدا نہیں کرنا
دیکھو ایسی خطا نہیں کرنا
عشق کی انتہا نہیں ہوتی
عشق کی انتہا نہیں کرنا
کچھ تو مجبوریاں بھی ہوتی ہیں
ہجر میں دل برا نہیں کرنا
خاک میں رولنا نہیں موتی
آنسوؤں کو رہا نہیں کرنا
جس طرح ملتے ہو رقیبوں سے
ہم سے ایسے ملا نہیں کرنا
بیل دل پر چڑھانا خواہش کی
لیکن اس کو بڑا نہیں کرنا
لوگ کچھ بھی کہیں تمہیں افضل
عشق میں کچھ سنا نہیں کرنا

جس طرف دیکھئے بازار نظر آتا ہے
ہر کوئی بکنے کو تیار نظر آتا ہے
ہم جسے دیکھ کے جیتے تھے بھری دنیا میں
اب وہی جینے سے بیزار نظر آتا ہے
اس کے ہاتھوں نہیں محفوظ کسی کی عزت
جو یہاں صاحب دستار نظر آتا ہے
اپنے جینے کی ہر اِک شخص تمنا رکھے
شہر سارا مجھے بیمار نظر آتا ہے
جنگ کرنے کے لیے جس نے ہمیں اُکسایا
سب سے پیچھے وہی سالار نظر آتا ہے
لوگ کچھ بھی کہیں تیرے عدو کو افضل
مجھ کو وہ صاحب کردار نظر آتا ہے

آنکھ میں کوئی ستارہ ہو ضروری تو نہیں
پیار میں کوئی خسارا ہو ضروری تو نہیں
یہ حقیقت کہ مجھے تجھ سے محبت ہے بہت
پر ترے ساتھ گزارہ ہو ضروری تو نہیں
یہ دریچے سے جو پھولوں کی مہک آتی ہے
تیرے آنے کا اشارہ ہو ضروری تو نہیں
ڈوبتے وقت نظر اس پہ بھی پڑ سکتی ہے
سامنے میرے کنارا ہو ضروری تو نہیں
جو مجھے چھوڑ گیا آج تمہاری خاطر
زندگی بھر وہ تمہارا ہو ضروری تو نہیں
ہو بھی سکتا ہے خطا اُس کا نشانہ افضل
تیر اُس نے مجھے مارا ہو ضروری تو نہیں

اس زمیں آسمان سے پہلے
ہم کہاں تھے جہان سے پہلے
سنگ رہ کو اگر ہٹانا ہے
ابتداء ہو چٹان سے پہلے
کیسے پہنچیں گے اپنی منزل پر
تھک گئے ہیں اُڑان سے پہلے
جب ہوائیں نہ ہوں تو کھولو تم
حوصلے بادبان سے پہلے
وہ نشانے پہ آ گیا یکدم
تیر ٹوٹا کمان سے پہلے

سلیمان جاذب/دُبئ

راستہ اپنا زمانے سے جدا رکھا ہے
ایک بے درد کو ہمدرد بنا رکھا ہے

سلیمان جاذب نے انٹرنیٹ جرنلزم اور ادب کی دنیا میں لگ بھگ ایک ساتھ قدم رکھا ہے اور دونوں میں ان کی کامیابی کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''تیری خوشبو'' ابتدائی جوانی کے محبت سے معمور جذبوں کا عمدہ اظہار ہے۔ ان جذبوں میں اضطراب و سرشاری کی مختلف کیفیات خوبصورت انداز سے آئی ہیں۔ نئی نسل کے قارئین ان آئینہ نما گہر تعلق محسوس کریں گے جبکہ میری عمر کے اور مجھ سے بڑی عمر کے لوگ بھی اس شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنی جوانی کے زمانوں کا سفر کرلیں گے۔ تاہم ابتدائے جوانی کی محبت کے جذبات سے سرشار ہونے کے باوجود سلیمان جاذب کے ہاں فکری پختگی بھی اپنی جھلک دکھانے لگی ہے۔ بعض اشعار میں یہ جھلک اتنی نمایاں ہے کہ اس سے سلیمان جاذب کے آئندہ امکانات کا بہتر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند سے باہر جعلی اور چور شاعروں کے ہجوم میں جہاں بھی کوئی اوریجنل اور جینوئن شاعر دکھائی دیتا ہے مجھے دلی خوشی ہوتی ہے۔ ایسے ماحول میں سلیمان جاذب جیسے نئے اور اچھے شاعر کی اُردو ادب میں آمد ہوا کے خوشگوار جھونکے جیسی ہے، ایسا خوشگوار جھونکا جس میں اس کے محبوب ہی کی نہیں اس کی اپنی اوریجنلٹی کی خوشبو بھی بھری ہوئی ہے۔

درختوں پر پرندوں کے بسیرے کچھ دنوں کے ہیں
تمہارے چاہنے والوں کے ڈیرے کچھ دنوں کے ہیں
جدا ہونے کے موسم میں جدا ہونا ہمیں بھی ہے
ملاقاتیں یہ شامیں یہ سویرے کچھ دنوں کے ہیں
کوئی دن ساتھ رکھ لو اپنے آنچل کی طرح مجھ کو
اے جانِ جاں تری بانہوں کے گھیرے کچھ دنوں کے ہیں
بڑے شہروں کی رونق گاؤں کو کھا جائے گی اِک دن
یہ گلیاں اور یہ روشن بنیرے کچھ دنوں کے ہیں
کسی قربت سے جاذبؔ روشنی ہو جائے گی یک دم
جدائی کے دنوں کے یہ اندھیرے کچھ دنوں کے ہیں

برسوں کا شناسا بھی شناسا نہیں لگتا
کچھ بھی دم ہجراں مجھے اچھا نہیں لگتا
کرلوں میں یقیں کیسے کہ بدلا نہیں کچھ بھی
لہجہ ہی اگر آپ کا لہجہ نہیں لگتا
اِک تیرے نہ ہونے سے ہوا حال یہ دل کا
بستی میں کوئی شخص بھی اپنا نہیں لگتا
کاغذ سے وہ مانوس سی خوشبو نہیں آئی
یہ خط بھی ترے ہاتھ کا لکھا نہیں لگتا
آنکھوں میں مری اس لیے جاذبؔ یہ نمی ہے
سوکھا ہوا دریا کبھی اچھا نہیں لگتا

دل کو بہت ستائے تری آرزو صنم
شام و سحر جلائے تری آرزو صنم
پیہم تڑپ رہا ہوں میں تیرے خیال میں
بسمل مجھے بنائے تری آرزو صنم
صورت ملن کی تجھ سے نہ کوئی دکھائی دے
سپنے مگر دکھائے تری آرزو صنم
جاناں ترے فراق میں ہے زندگی کٹھن
کانٹوں پہ لا بٹھائے تری آرزو صنم
اِک عمر سے ہے فصل خزاں میں یہ دل مرا
فصل بہار لائے تری آرزو صنم

وقت کے سیل بلا کو روکنا مشکل بہت
بے بسی کے مرحلوں کو چھوڑنا مشکل بہت
خواہشیں روزِ ازل سے زندگی کے ساتھ ہیں
زندگی میں خواہشوں سے بھاگنا مشکل بہت
تلخی حالات، مجبوری، الم، بے چارگی
ان کٹھن راہوں میں خود کو ڈھونڈنا مشکل بہت
قصۂ پارینہ جاذبؔ بن گئے علم و ادب
گم شدہ میراث کو اب کھوجنا مشکل بہت

راستہ اپنا زمانے سے جدا رکھا ہے
ایک بے درد کو ہمدرد بنا رکھا ہے

روشنی یوں تو نہیں چہرے پہ اپنے اتنی
اس کی تصویر کو سینے میں سجا رکھا ہے
رات جاتی ہے مگر نیند نہیں آنکھوں میں
تیری یادوں نے عجب شور مچا رکھا ہے
پاؤں ٹکنے نہیں دیتی کہیں غم کی آندھی
آس کا دیپ مگر دل نے جلا رکھا ہے
کیا تجھے یاد کرے گا وہ خوشی میں جاذبؔ
ساعتِ غم میں تجھے جس نے بھلا رکھا ہے

تیری تصویر کو سینے میں سجا رکھا ہے
اور یہ بھید زمانے سے چھپا رکھا ہے
آندھیاں ایسی کہ کھلتی نہیں آنکھیں میری
آس کا دیپ مگر پھر بھی جلا رکھا ہے
اس لیے بھی ہے قریں اوروں سے منزل میری
راستہ میں نے زمانے سے جدا رکھا ہے
اُس کو تو نام بھی معلوم نہیں ہے میرا
نام کے ساتھ عجب نام ملا رکھا ہے
اِک دعا ماں کی مرے ساتھ ہے جاذبؔ ورنہ
رہ گزاروں نے مجھے آبلہ پا رکھا ہے

تبصرہ کتب

کتاب کا نام : اسرائیل میں چندروز......!

تبصرہ نگار : عامر بن علی

مصنف : کے-اشرف

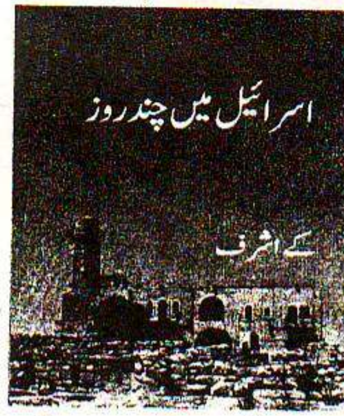

امریکہ میں مقیم معروف ادیب اور دانشور کے-اشرف کا سفرنامہ ''اسرائیل میں چندروز......'' کئی لحاظ سے ، منفرد اور بے مثال ہے۔ کے- اشرف پہلے پاکستانی ہیں جنہوں نے اسرائیل کا سفرنامہ لکھا ہے۔ اسرائیل کے ساتھ پاکستان کے سفارتی تعلقات نہ ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کے لیے اسرائیل کا سفر کرنا ممکن ہی نہیں اور اگر کچھ پاکستانی وہاں گئے بھی ہیں تو وہ اہل قلم نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکیسویں صدی جسے انفارمیشن ٹیکنالوجی کا دور کہا جاتا ہے اس عہد میں بھی اسرائیل کے متعلق عام پاکستانی کی معلومات بہت ہی کم ہیں۔ معلومات سے یہاں میری مراد ان کے رہن سہن اور روزمرہ زندگی کے متعلق باتیں ہیں اور ان باتوں میں بھی چاشنی تبھی ہوتی ہے جب کوئی آپ کا ہم وطن ہم زباں یہ بیان کر رہا ہو۔ اسرائیل میں ایک پاکستانی کو جو تجربات ہوئے اس کا بیان بلاشبہ اُردو زبان کے قارئین کے لیے ایک منفرد تحفہ ہے۔ کتاب کا انتساب غریب فلسطینیوں سے کیا گیا ہے جو اپنے وطن میں ہی غریب الدیار ہیں۔ اس سفرنامے کا ایک امتیاز اس میں شامل رنگین تصاویر ہیں جن سے کتاب کا مزہ دوآتشہ ہو گیا ہے۔ انتہائی اعلیٰ طباعت اور خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ ''اسرائیل میں چندروز......!'' کیلی فورنیا کے شہر مرکلے سے شائع ہوئی ہے۔ کے-اشرف بھی گزشتہ تین دہائیوں سے مرکلے میں ہی مقیم ہیں۔ امریکہ جلاوطن ہونے سے پہلے وہ پاکستان میں کالج پروفیسر تھے۔ ترقی پسند خیالات اور تحریروں کی وجہ سے آمر جنرل ضیاء الحق کے عتاب کا شکار رہے اور جلاوطنی اختیار کرنے پر مجبور کر دیے گئے۔ کئی ناول تصنیف کیے، اس کے علاوہ افسانہ نگاری و شاعری تو ان کی پہچان پہلے سے ہی تھی۔ اب سفرنامہ نگاری میں بھی ان کا معتبر حوالہ بن گیا ہے۔ سادگی وسلامت کے ساتھ واقعات میں تسلسل اور تحریر کی روانی قاری کو ''اسرائیل میں چندروز'' پڑھتے ہوئے اس طرح جکڑ لیتی ہے کہ کتاب ختم کرنے سے پہلے اُسے رکھنے کو جی نہیں کرتا۔ ایک خاص بات جس نے مجھے متاثر کیا وہ یہ ہے کہ مصنف نے تاریخ کی بھول بھلیوں میں کھونے کی بجائے آج کے دور پر توجہ مرکوز رکھی ہے۔ بیان کرتے ہوئے یہ یہ قرین قیاس تھا۔ کتاب کے نام پر ایک ممکنہ اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ اس کا نام ''فلسطین میں چندروز'' ممکن نہیں ہے۔ مصنف نے اس کا بڑا تسلی بخش اور سادہ جواب دیا ہے کہ میرے پاسپورٹ پر ویزہ اور مہر اسرائیل کی لگی ہوئی ہے اس لیے بہتر نام بھی یہی لگتا ہے۔

کتاب کا نام : شام وسحر کے درمیاں

تبصرہ نگار : حسن عباسی

مصنف : رئیس عباس زیدی

قیمت : -/400روپے

ناشر : نستعلیق مطبوعات

غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور

یادیں دل کے دریچوں پہ پھولوں والی بیلوں کی طرح ہوتی ہیں۔ رئیس عباس زیدی نے ''شام وسحر کے درمیاں'' نہ تو اپنا آپ گم ہونے دیا ہے اور نہ ہی یادوں کی کسی بیل کو مرجھانے دیا ہے۔ وہ ان بیلوں پر کھلنے والے پھولوں کو توڑ کر اپنے گلدان میں سجانے کے بجائے لفظوں کے دھاگے میں پروتے چلے گئے ہیں جو کہ اب انتہائی خوبصورت کتاب کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ ایک انگریز دانشور نے اپنے بیٹے کو ایک طویل خط لکھا اور آخر میں یہ طویل خط لکھنے کی وجہ یہ بیان کی کہ مختصر لکھنے کے لیے اُس کے پاس وقت نہیں تھا۔ رئیس عباس زیدی کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے مختصر لکھنے کے لیے وقت نکالا اور دریا کو کوزے میں بند کر دیا جو کہ نثر میں جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ جس طرح پینٹنگز میں یہ بات اہم نہیں ہے کہ کیا بنانا ہے بلکہ یہ بات اہم ہے کہ کیا نہیں بنانا ہے تب جا کر شاہکار تخلیق ہوتا ہے اسی طرح رئیس عباس زیدی بھی ''کیا نہیں بنانا'' کے ہنر سے بخوبی آشنا ہیں اس لیے جو تخلیق کیا ہے اُسے دلکش کہا جاسکتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ انہوں نے کتاب میں دلچسپی کا عنصر کہیں بھی کم نہیں ہونے دیا تو بے جا نہ ہوگا۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے واقعات کو نہایت خوبصورتی سے قلمبند کیا ہے۔ مجھے اُمید ہے یہ کتاب قاری ایک سے زائد بار پڑھنے پر مجبور ہوگا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس کتاب کی پذیرائی زیدی صاحب کو ایک اور کتاب کی طرف لائے گی۔ میری دُعا ہے کہ وہ یونہی اپنی تحریریں نذرِ قارئین کرتے رہیں۔ آمین

مکاتیب شمس الرحمٰن فاروقی بنام راشد

(۱)

23-D
Thorn Hill Road
Allahabad-1

۲۲ مئی ۶۸ء

برادر مکرم و محترم، تسلیم! بلا تعارف مخاطب ہونے کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ اُمید ہے آپ اس جرات کو نظر انداز کر دیں گے۔ آپ کے پتے کی مجھے عرصے سے تلاش تھی۔ عزیزی عزیز الدین شکیل کے ذریعہ معلوم ہوا کہ آپ تہران میں قیام فرما ہیں۔ انھوں نے آپ کی خدمت میں شب خون کے چند پرچے بھی پیش کیے ہیں اور میری طرف سے درخواست کی ہے کہ آپ اس پرچے کو اپنی تخلیقات سے نوازیں۔

ہندو پاک کی جدید شاعری کی تعمیر نو میں جناب کا جو اہم رول رہا ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ آپ کے افکار نے اُردو کی نئی نسل کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ پچیس تیس برس پہلے اُبھرنے والی نسل میں صرف آپ اور فیض ہی وہ شاعر ہیں جنھیں جدید نسل اپنا امام مانتی ہے اور لطف یہ ہے کہ اب تو سکہ بند ترقی پسند حضرات بھی آپ دونوں کو اپنے حلقہ کا شاعر ماننے اور ثابت کرنے پر مصر ہیں۔ فیض صاحب پر سردار جعفری نے شدید اعتراضات کیے تھے، لیکن اب وہ خود کو فیض کی Company میں رکھوانے پر مصر ہیں۔ افتخار جالب کی مرتب کردہ تنقیدی کتاب ''نئی شاعری'' آپ کے ذکر سے بھری پڑی ہے اور جعفری صاحب بھی آپ کا کلام شائع کرنا مایہ افتخار سمجھتے ہیں۔ اس لیے آپ جیسے شعرا کو عہد ساز کہا جاتا ہے تو کچھ غلط نہیں ہے۔

ان جملوں کو صرف حقیقت حال کا اعتراف سمجھیے، یہ آپ کو خوش کرنے کا سستا نسخہ نہ سمجھیے گا۔ میں نے وہی باتیں لکھی ہیں جو میں واقعی محسوس کرتا ہوں۔

آپ سے استدعا ہے کہ آپ شب خون کو اپنے کلام سے نوازیں اور اس سلسلے کو قائم رکھیں۔ شکریہ۔

شب خون کے چار پرچے آپ کی خدمت میں ہوائی ڈاک سے روانہ کر دیے ہیں، آئندہ بھی یہ پرچہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہے گا۔

آپ کا
شمس الرحمٰن فاروقی

(۲)

Private Quarters
Behind Block No "B"
River Bank Colony
Lucknow-1

برادر محترم، مکرم، تسلیم! عزیز الدین کے خط سے آپ کی خیریت معلوم ہوئی۔ میں بھی آپ کو ان کے ہی ذریعہ خط لکھنے والا تھا۔ یہ ارادہ تو عرصے سے تھا لیکن ان دنوں خاص تحریک یوں ہوئی کہ پچھلے دنوں محمود ہاشمی، خلیل الرحمٰن اعظمی، شہر یار، بلراج کومل اور بہت سے لوگ میرے یہاں جمع تھے۔ اکثر آپ کی شاعری کا ذکر چھڑتا رہا۔ آپ کا شعری ارتقا، آہنگ شعر، موضوعات، سب زیر بحث آئے۔ ہم سب نے تسلیم کیا کہ اپنے بعد آنے والی نسل پر آپ کی شاعری کا جو اثر پڑا ہے وہ دوررس، دیرپا، اہم اور بہ ظاہر زیر زیر میں لیکن در حقیقت تمام میں جاری و ساری ہے۔ ہم سب کو اس بات پر بھی حیرت تھی کہ اس وقت جب آپ کے تمام ہم عصر پرانے سبق دہرا رہے ہیں آپ کی توانائیاں نئی راہوں پر گامزن ہیں۔ بے اختیار جی چاہا کہ اس وقت آپ بھی یہاں موجود ہوتے۔

بہر حال یہ سب تو جملہ معترضہ تھا۔ یہ معلوم کر کے بہت افسوس اور شرمندگی ہوئی کہ شب خون آپ کی خدمت میں نہیں پہنچ رہا ہے۔ میں عزیز الدین کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے آپ کو پرچے فراہم کر دیے۔ انشاء اللہ آئندہ ایسی صورت نہ پیدا ہوگی۔ میں نے اختر کو سخت ہدایت کر دی ہے۔ اگر آپ پہلا پرچہ Miss کرتے ہی مجھے یا اختر کو یا عزیز الدین کو مطلع کر دیتے تو آپ کو یہ زحمت نہ ہوتی۔

الشال کے انعقاد کی خبر مجھے مل چکی ہے۔ منیر نیازی نے مجھے لکھا بھی تھا کہ وہ لا = انسان مجھے بھجوا رہے ہیں اور دوسری کتابیں بھی۔ کتابیں ابھی تک آئی نہیں ہیں۔ میں منیر نیازی کو پھر لکھ رہا ہوں۔ کتابیں ملتے ہی انشاء اللہ ان پر مفصل تبصرہ ہوگا۔ جدید ایرانی شاعری پر تبصرہ ڈاکٹر نیر مسعود سے لکھواؤں گا۔ یہ مسعود حسن رضوی ادیب کے صاحب زادے ہیں، انتہائی خوش ذوق اور وسیع المطالعہ ہیں اور آپ کے مداح بھی ہیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی اُردو کے اُستاد ہیں۔ لا = انسان پر میں خود لکھوں گا یا محمود ہاشمی سے لکھواؤں گا۔

اگر میں یہ تجویز رکھوں کہ لا = انسان کے ہندوستانی حقوق شب خون کو عنایت ہو جائیں تو آپ کیا کہیں گے؟ معاوضہ کی کیا صورت ہوگی؟

آپ کی نظموں کا شدید ترین انتظار ہے۔

آپ کا
شمس الرحمٰن فاروقی

۵ جون ۶۹ء

(۳)

23-D Thorn Hill Road
Allahabad-1

برادر مکرم! تسلیم! آپ کی خوب صورت نظم کی رسید لکھ چکا ہوں۔ خط ملا ہوگا۔ آپ کی مطلوبہ کتاب الٰہ آباد میں نہیں مل رہی ہے، بہر حال میں کوشش میں ہوں۔ جیسے ہی مل جائے گی حاضر خدمت کروں گا۔ قیمت کا کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے۔

یہ خط ایک خاص غرض سے لکھ رہا ہوں۔ جب کہ آپ کو منسلکہ پلندے سے معلوم ہوگا، یہ اس ناچیز کا مجموعہ کلام ہے۔ کتاب چھپ چکی ہے، سرورق باقی ہے۔ مجھے اپنی شاعری کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ پر فرض عائد کرنا ایک طرح کی گستاخی ہی ہے، لیکن میرے چند دوستوں، خاص کر محمود ہاشمی کا اصرار ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں۔ لہٰذا یہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔

مجموعہ آپ کے سامنے ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس پر ایک تبصرہ لکھ دیں۔ تبصرہ شب خون میں شائع ہوگا اور اس کا اقتباس کتاب کے آخری سرورق پر چھپے گا۔ چوں کہ کتاب چھپ ہی چکی ہے اس لیے یہ بھی عرض ہے کہ آپ دو ہفتے کے اندر ہی اندر عنایت کر دیں۔ اگر تبصرہ لکھنے کے لیے وقت کم ہو یا تبصرہ کرنا پسند نہ کریں تو ایک پیراگراف کی رائے ہی بھیج دیں۔ تبصرہ بعد میں ہو سکتا ہے بشرطیکہ آپ کا دل چاہے۔ یہ واضح کر دوں کہ اس کتاب پر آپ کے علاوہ کسی کی رائے نہیں چھپے گی۔ اگر آپ کی رائے نہ مل سکی تو کوئی بھی رائے نہ چھپے گی۔ ظاہر ہے کہ رسمی قسم کی رائے تو بہت سے لوگ لکھ سکتے ہیں لیکن اس محبت نے جو آپ مجھ سے رکھتے ہیں، مجھے یہ ہمت دلائی ہے۔ آپ یقین کیجیے آپ کی رسمی رائے مطلوب نہیں ہے اور یہ درخواست Certificate Hunting قسم کی چیز نہیں ہے۔ اگر آپ کو اطمینان ہو کہ یہ

شاعری آپ کی توجہ کی مستحق ہے، تب ہی آپ کچھ لکھیں۔ معینہ وقت کے اندر تبصرہ یارائے مل جائے تو بہت ممنون ہوں گا۔

اُمید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

آپ کا
شمس الرحمٰن فاروقی
۱۲/اگست ۶۹ء

پتہ الٰہ آباد کا دے رہا ہوں تا کہ ہر صورت میں مجھے مل جائے۔

(۴)

Private Quarters
Behind F Block
River Bank Colony
Lucknow-1
۶۹-۱۱-۳۰

برادرِ مکرم، تسلیم وآداب! نوازش نامہ الٰہ آباد سے ہوکر ملا۔ میں نے گنج سوختہ اب تک آپ کی خدمت میں اس لیے نہیں بھیجی تھی کہ یہ نہیں معلوم تھا کہ آپ بیرونِ ملک سے واپس آئے یا نہیں۔ یہ جان کر تشویش ہوئی کہ لندن میں آپ کے دو آپریشن ہوئے۔ خدا کرے سب خیریت سے گزر گئی ہو۔

آپ کی تقریظ مل گئی تھی۔ میں نے فوراً ہی شکریہ اور رسید کا خط لکھ دیا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس کے پہنچنے کے پہلے ہی تہران سے نکل چکے تھے۔ ایک بار پھر دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ تقریظ کو عام طور پر پسند کیا جارہا ہے۔ کتاب حاضر کررہا ہوں۔

یہ معلوم کرکے بڑی خوئی کہ آپ دونوں کتابیں یہاں شائع کرانے پر رضامند ہیں لیکن سب سے بڑا مسئلہ رائلٹی کا ہے۔ روپیہ جانے کی کوئی صورت نہیں ہے اور وہاں سے کتابیں زیادہ تعداد میں یہاں آنہیں سکتیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ روپے یہاں کسی کو دے دیے جائیں اور وہاں آپ میرے نمائندے سے لے لیں۔ اس سلسلے میں بلاتکلف لکھئے کہ آپ کے شرائط کیا ہوں گے۔ اگر مجھ سے بن پڑا تو یقیناً حاضر کروں گا۔ آپ کے تفصیلی جواب کا انتظار رہے گا۔ ادائیگی عثمانی صاحب کے ذریعہ ہوسکتی ہے۔

پچھلے دنوں میں گورکھ پور گیا تھا۔ وہاں ایک صاحب نے بتایا کہ شب خون میں آپ کی نظم پڑھ کر انھیں آپ کے کلام سے دوبارہ بہت زیادہ دل چسپی پیدا ہوئی۔ اب جو انھوں نے ایران میں اجنبی وغیرہ پڑھیں تو انھیں دوہرا لطف حاصل ہوا۔

اپنی کوئی نظم جلد از جلد عنایت فرمائیں۔ اُمید ہے شب خون برابر مل رہا ہوگا۔

خدا کرے آپ ہر طرح اچھے ہوں۔

آپ کا
شمس الرحمٰن

مکرر۔ میں نے آپ کی شعر خوانی کی بہت تعریف سنی ہے۔ کیا آپ Tape پر اپنی کچھ نظمیں بھیج سکتے ہیں؟ میرے پاس "1/4 سائز Tape کا جاپانی ریکارڈر ہے۔ میں اس پر منتقل کرکے اپنی نظموں کے ساتھ آپ کو واپس کردوں گا۔ اور اپنی ایک تصویر بھی عنایت کیجیے گا۔

(۵)

برادرِ مکرم، تسلیم! ۸/دسمبر کے کرم نامے کے لیے ممنون ہوں۔ میں کچھ دنوں کے لیے الٰہ آباد میں ہوں۔ خط یہیں ملا اور فون سے معلوم ہوا کہ لا = انسان کا مسودہ بھی آ گیا ہے۔ دوشنبہ کو واپس جاؤں گا تو اسے دیکھ کر دوسرا خط لکھوں گا۔ اس عنایت کے لیے شکرگزار ہوں۔ اب چوں کہ آپ انشاء اللہ ہندوستان تشریف لا رہے ہیں، اس لیے رائلٹی کی رقم آپ کو دلی (یا بمبئی جہاں آپ پہلے پہنچیں) پہنچتے ہی مل جائے گی۔ ازراہِ کرم یہ مطلع کریں کہ کتاب کی قیمت میں پندرہ فی صدی رائلٹی آپ کو منظور ہوگی یا نہیں۔ مسودہ دیکھ کر عرض کرسکوں گا کہ کتاب کی قیمت کیا رکھی جائے گی۔ دونوں کتابیں ایک ایک ہزار چھپیں گی۔

جدید ایرانی شاعری والی کتاب میں، میرے خیال میں اصل فارسی اور شعرا کی تصویریں غیر ضروری ہیں۔ تمہید (جو غالبًا آپ کی لکھی ہوئی ہے) ضروری ہوگی۔ آپ فی الحال اتنا ہی بھجوائیں۔ اگر دوبارہ غور کرنے پر اصل کی ضرورت سمجھی تو منگوالوں گا۔

آپ کے دورۂ ہندوستان کے دوران، آپ کی موجودگی سے فائدہ اُٹھا کر شب خون کا مالی خسارہ کم کرنے کے لیے ایک دو مشاعرے کیے جاسکتے ہیں۔ اگر ان سے کچھ فائدہ ہوا تو کچھ رقم اور بھی آپ کی خدمت میں حاضر کرسکوں گا، جو مشاعرہ میں تشریف آوری کی فیس ہوگی۔ مشاعرے دہلی اور لکھنؤ میں آسانی سے ہوسکتے ہیں۔ آپ کے علاوہ دوچار سربرآوردہ جدید شعرا ہوں گے، بس۔ لکھئے گا کہ اس تجویز سے آپ کہاں تک متفق ہیں۔

آپ نے جو نظمیں ''اوراق'' اور ''نیا دور'' کو بھیجی ہیں وہی مجھے بھجوادیں۔ یہ پرچے اب ادھر آنہیں پاتے ہیں، اس لیے یہ نظمیں بھی غیر مطبوعہ ہی سمجھیں۔ تازہ نظم کا وعدہ تو آپ نے ازراہِ نوازش کر ہی لیا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ آپ تحت اللفظ پڑھتے ہوں گے۔ نظم خوانی کے لیے ترنم لعنت ہے۔ میں تو پوری شعر خوانی کے لیے ترنم کو لعنت سمجھتا ہوں۔ خود بھی تحت ہی میں پڑھتا ہوں۔ آپ Tape عثمانی صاحب کو دے دیں، میں ان سے لے لوں گا۔ میرا Recorder چھوٹا ہے، یعنی Sony کا Portable۔ لیکن اگر آپ بڑی ٹیپ بھی بھیجیں گے تو میں اسے کسی دوست کے Recorder پر سن کر Tape کرلوں گا۔

اُمید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

آپ کا
شمس الرحمٰن فاروقی
۱۹/دسمبر ۱۹۶۹ء

(۶)

۲۳ جنوری ۷۰

برادرِ مکرم، تسلیم! میں ان دنوں دوبارہ بیمار پڑ گیا تھا، اس لیے خط نہ لکھ سکا۔ اس اثناء میں آپ کی نظمیں بھی موصول ہوگئیں۔ اس عنایت خاص کے لیے دل سے شکرگزار ہوں۔ ان نظموں کو دو اشاعتوں میں شائع کروں گا۔ مارچ اور اپریل میں لا = انسان کا مسودہ مل گیا تھا، اس وقت یہ بھی یاد نہیں کہ اس کی رسید لکھی تھی کہ نہیں۔ بہرحال، صورتِ حال یہ ہے کہ جس قیمت اور جس کاغذ کے ساتھ کتاب وہاں چھپی ہے، یہاں ممکن نہیں۔ ایک ہزار کا Edition بھی ذرا بھاری ہو جائے گا۔ میرا ارادہ ہے کہ ۷۵۰ کتابوں کا Edition ہو۔ قیمت ۶ روپے رکھی جائے، چھپائی کتابت کی ہو۔ 15% کے حساب سے جو رقم بنتی ہے وہ آپ کو یک مشت ہندوستان تشریف لانے پر یا عثمانی صاحب کے ذریعہ ادا کردی جائے۔ ازراہِ کرم اپنی منظوری یا دیگر شرائط سے مطلع فرمائیں۔

جدید فارسی شاعری کے بارے میں میری Rethinking یہ ہے کہ اصل متن بھی شامل کتاب ہو جائے تو نصابوں میں بھی رکھی جاسکتی ہے اور فروخت کی ایک صورت نکل آئے گی۔ اس لیے آپ مسودہ اسی طرح بنوائیں، شکریہ۔

مجھے یاد نہیں آ رہا ہے کہ یہ سب باتیں آپ کو لکھ چکا ہوں کہ نہیں۔ اگر لکھ چکا ہوں تو دوبارہ سمع خراشی کو معاف فرمائے گا۔

تصویر اور Tape کا انتظار ہے۔

لا = انسان ص ۱۴، سطر ۱۷۔ لفظ ا تا ئی سے کیا مراد ہے؟ یہ عطائی تو نہیں؟

ص ۱۶، سطر ۲۳۔ یہ لفظ خواب آ گوں تو شاید نہ ہوگا؟ خواب گوں یا خاب آ گیں؟

ص ۷۰، سطر ۱۰۔ آلات یا حالات؟

اُمید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔ نظموں کے گراں قدر عطیے کے لیے ایک بار پھر ممنون ہوں۔

آپ کا
شمس الرحمٰن فاروقی

(۷)

۷۰/۲/۲۲

برادرِ مکرم! ۳۱ جنوری کا خط ملا، ممنون ہوں۔ آپ کی تجویز فارسی شاعری والی کتاب کے بارے میں مجھے منظور ہے۔ درسی کتاب کا سلسلہ پھر کبھی سہی۔

لا = انسان کی کتابت شروع کرانے والا ہوں۔ اس کے اجزا جب معتد بہ تعداد میں کتابت ہو جائیں آپ کو پڑھنے کے لیے بھیجتا رہوں گا۔

UNO میں جن صاحب کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے ان کا نام پتا لکھیے تاکہ میں انھیں خط لکھوں۔ عزیز الدین کو بھی لکھ رہا ہوں۔ جس ذریعے سے بھی کام ہو جائے، ٹھیک ہے۔

آپ کی نظموں کی Tape مجھے مل گئی ہے، ممنون ہوں لیکن میرے پاس جو Recorder ہے اس کی Speed مختلف ہے، اس لیے مناسب Recorder کی تلاش میں ہوں۔ میں چاہتا تھا کہ آپ کو اپنے بھی Recitation کی Tape بھیجوں۔ براہِ کرم یہ لکھیں کہ اسی کو دوبارہ استعمال کر لوں یا نئی Ta e بھجواؤں۔ مجھے چوں کہ اس سے Record کرنا پڑے گا اس لیے میں اسے آسانی سے Spare کرسکتا ہوں۔

آپ کی ایک لمبی نظم تازہ شمارے میں شامل ہے۔ بقیہ نظمیں اگلے شمارے میں دے رہا ہوں۔

آپ کا
شمس الرحمٰن فاروقی

(۸)

برادرِ مکرم، تسلیم! آپ کی ٹیپ واپس کرنے میں تاخیر اس لیے ہو رہی ہے کہ مناسب Speed کا Recorder نہیں مل رہا جس پر Play کر کے میں اپنے Recorder پر اُتار لوں۔ آج یا کل میں یہ مسئلہ حل ہو جائے گا تو وہ ٹیپ مع اپنی نظموں کے واپس کردوں گا۔

لا = انسان کے ہندی روپ کے بارے میں بات کروں گا۔ اُردو افسانہ اور ناول تو ہندی میں بہت چلتا ہے لیکن شاعری کی اتنی مانگ ابھی نہیں ہے۔

UN میں جن صاحب کا ذکر آپ نے کیا تھا، ان کا پتا عنایت فرمائیے۔

اس بار آپ کی نظمیں ذرا Congested طریقے سے شائع ہوئی ہیں۔ کئی چیزیں اندازے سے زیادہ بڑھ گئیں، معذرت خواہ ہوں۔

ہندوستان کے جن شعرا کے دیوان آپ چاہیں بھجوا سکتا ہوں۔ فی الوقت مندرجہ ذیل مجموعے میرے ذہن میں ہیں:

خلیل الرحمٰن اعظمی	نیا عہد نامہ
منیب الرحمٰن	بازدید
شہریار	اسمِ اعظم
=	ساتواں در (زیرِ طبع)
کمار پاشی	پرانے موسموں کی آواز
=	خواب تماشا
بلراج کومل	سفر مدام سفر
محمد علوی	خالی مکان
=	آخری دن کی تلاش
اختر الایمان	بنت لمحات
عمیق حنفی	شب گشت
شاذ تمکنت	تراشیدہ
وحید اختر	پتھروں کا مغنی
ندا فاضلی	لفظوں کا پل

ان میں سے جو آپ چاہیں بھجوائے جاسکتے ہیں۔

ماورا کے ہندی ایڈیشن کی مجھے کوئی خبر نہیں ہے، پتا لگوا رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ کا مزاج اچھا ہوگا۔

آپ کا
شمس الرحمٰن فاروقی

(۹)

۷۰-۷-۱۲

برادرِ مکرم و محترم، تسلیم! آپ مجھے سخت بدتہذیب سمجھ رہے ہوں گے کہ تین تین خطوں کا جواب اور نظموں کی رسید بھی لکھنے کا روادار نہ ہوا۔ میں سخت شرمندہ ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دنوں میری طبیعت کچھ خراب رہی۔ میں مصروف بھی بہت رہا۔ ان باتوں کا اندازہ اس طرح لگائیے کہ شب خون کا تازہ شمارہ جو جون کی بیس تک آنا تھا، آج تک نہ نکل سکا۔ شب خون کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے اور صرف اس وجہ سے کہ میں تقریباً مہینہ بھر بالکل تعطل کا شکار رہا۔

نظموں کے بارے میں یہ عرض کرنا ہے کہ ایک نظم تازہ شمارے میں اور ایک اگلے میں آ رہی ہے۔ آپ کی یہ دونوں نظمیں بہت پسند آئیں۔ خاص کر اس وجہ سے کہ یہ نظمیں آپ کے اسلوب میں ایک نئے موڑ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اپنے ہم عصروں میں آپ واحد شاعر ہیں جنھوں نے Look back نہ کرنے کی قسم کھائی ہو۔ ہر نظم امکانات کی طرف لے جاتی ہے۔

میں اب تک دہلی Draft نہیں بھیج سکا ہوں۔ رقم کا انتظام نہیں ہوسکتا ہے اس وجہ سے کتاب پر کام بھی نہیں شروع ہوا۔ یہ الگ شرمندگی ہے۔ بہرحال انشاءاللہ تین مہینوں میں کتاب پوری آجائے گی۔ Draft بھی ایک مہینے کے اندر روانہ کرسکوں گا۔ جدید فارسی شاعری کا مسودہ ابھی نہیں ملا ہے۔ اگرچہ عزیز الدین نے خبر دی ہے کہ روانہ کر دیا گیا ہے۔ ملتے ہی مطلع کروں گا۔

آپ نے جس محبت سے تہران آنے کی دعوت دی ہے اس کے لیے ممنون ہوں۔ مالی حالات ایسے نہیں ہیں کہ نکل سکوں۔ اگرچہ غالب کی طرح شیراز جا نکلنے، گھر چھوڑ کر جہانیاں جہاں گشت ہو جانے کا ارمان بہت ہے، لیکن شطرنجی اور سُتلی میں لٹکائے ہوئے لوٹے کی ہمت بھی نہیں ہے۔

اگر آپ ہندوستان تشریف لا سکے تو بہت خوب ورنہ انشاءاللہ کہیں نہ کہیں ملاقات ضرور ہوگی۔

آپ کو خبر ہوگی، شعر و حکمت کے اگلے شمارہ میں آپ پر ایک خصوصی Section ہوگا۔ لا = انسان کے حوالے سے ایک مضمون میں بھی لکھ رہا ہوں۔

شب خون کے موجودہ شمارے میں میرا ایک مضمون ہے، Commitment اور Establish- mentarianism کے مسائل پر۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ بھی اپنے خیالات کا اظہار اس ضمن میں کریں۔ ضرور بالضرور۔ آج کل یہ موضوع یہاں بہت زیرِ بحث ہے۔ سرور صاحب اور چند دوسرے سربرآوردہ لوگوں کو بھی دعوت دے رہا ہوں۔

آپ کا
شمس الرحمٰن

حسبِ ہدایت ''دھنگی رانوں'' کو ''موٹی رانوں'' میں بدل دیا ہے۔

(۱۰)

۷۰-۷-۲۲

برادرِ مکرم، غالب کے شعر نے تڑپا دیا۔ ایک عجیب سی فرحت بھی ہوئی کہ آپ کے دل میں میرے لیے تھوڑی بہت جگہ ہے اور معاملہ صرف رسمی نہیں ہے، خردی اور بزرگی کے رشتوں میں انسانی گرمی اکثر بجھ بھی جایا کرتی ہے۔

میرا خیال ہے اب تک آپ کو بھی میرا مفصل خط مل گیا ہوگا جو میں نے گیارہ یا بارہ کو لکھا تھا۔ آپ کو انتظار کی اتنی

زحمت کھینچنی پڑی، شرمندہ ہوں۔ جدید فارسی شاعری کی رسید بھی فوراً ہی لکھ دی تھی، یقین ہے دونوں خط مل گئے ہوں گے۔

عثمانی صاحب کے پتے پر چار کتابیں آپ کی خدمت میں بھیج دی گئی ہیں۔ بقیہ چار انشاء اللہ دس دن میں روانہ ہوں گی۔ رسید سے مطلع فرمائیں گے۔

اُمید ہے شب خون بھی مل گیا ہوگا۔

آپ کا
شمس الرحمٰن

(۱۱)

الٰہ آباد
۲۳-۱۰-۷۰

برادرِ مکرم و محترم! آپ کے دو کرم ناموں کا جواب مجھ پر قرض ہے۔ یقین ہے کہ اب تک آپ مجھ کو صبر کر چکے ہوں گے۔ میں آپ سے انتہائی شرمندہ ہوں کہ پچھلے کئی مہینوں سے خط لکھنے میں بہت تاخیر ہو رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں دفتر کے کاموں کے ساتھ ساتھ طبیعت کی خرابی نے بہت پژمردہ کر رکھا تھا۔ دن بھر کام کرنے کے بعد رات کو خطوط کے جواب لکھنے، پڑھنے یا مضمون وغیرہ لکھنے بیٹھتا ہوں۔ تفریحی زندگی پہلے تاش کھیلنے اور ناولیں پڑھنے تک محدود تھی، اب تاش تقریباً بند ہے، ناولیں پڑھنے کی رفتار بھی کم ہوگئی ہے۔ بہت دنوں سے دورانِ سر، شام حالات نے زندگی کے مشاغل میں خاصا انتشار پیدا کر دیا ہے۔ خطوط جمع ہوتے رہتے ہیں۔ پھر ایک دن بیٹھتا ہوں، بائیس چوبیس گھنٹے کی محنت کے بعد کسی نہ کسی طرح اُن کو نپٹا تا ہوں۔

یہ سب اس لیے لکھ رہا ہوں کہ میری طویل خاموشی نے اگر کوئی تکدر خدانخواستہ آپ کے دل میں پیدا کیا ہو تو شاید رفع ہو جائے۔

آپ کے ان دو خطوں (۲۲ جولائی اور ۳۰/اگست) کے درمیان کسی وقت میں نے ایک خط لکھا تھا جس میں جدید فارسی شاعری کے مسودے کی رسید تھی اور یہ اجازت مانگی تھی کہ اس کے دیباچے کو شب خون میں مضمون کے طور پر شائع کر دوں۔ وہ خط شاید آپ کو نہیں ملا۔ میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ آپ نے دیباچے میں مجھ ناچیز کا تذکرہ کر کے اپنی محبت کا ثبوت دیا ہے، ممنون ہوں۔ اگر آپ کی اجازت مل جائے تو دیباچہ شائع کر لوں۔ لا = انسان کو دو تین بار غور سے ادھر پھر پڑھا ہے۔ ایک آدھ جگہ طباعت کی غلطیاں نظر آئیں۔ اس وقت کتاب سامنے نہیں ہے، مضمون لکھنے بیٹھوں گا تو ان کی ایک فہرست بنا کر آپ کو بھیج دوں گا۔ کوشش کروں گا کہ مضمون کی نقل ہی بھجوا دوں۔ ''نیا دور'' کراچی کا خط آیا ہے۔ انھوں نے مجھ سے مضمون مانگا ہے۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ راشد صاحب پر مضمون لکھ رہا ہوں، وہی بھیج دوں گا۔

مضمون کا نقشہ ذہن میں تیار کر لیا ہے، انشاء اللہ اگلے ہفتے ضرور مکمل ہو جائے گا۔

شب خون کے کاتب سلیم اللہ آج کل پاکستان چلے گئے ہیں۔ جن صاحب سے کتابیں لکھواتا تھا وہ آج کل شب خون لکھ رہے ہیں اس لیے لا = انسان کی کتابت ابھی شروع نہیں ہو پائی ہے۔ یہ بھی خیال ہے کہ آپ کا قرض ادا کر لوں تو اطمینان سے کام شروع ہو۔

ادھر آپ نے کوئی نظمیں لکھی ہوں تو ازراہِ کرم عنایت فرمائیں۔ آپ کی مدتِ ملازمت میں توسیع کا کیا بنا؟ یقین ہے کہ مل گئی ہوگی اور آپ ۱۹۷۱ء میں ہندوستان تشریف لائیں گے۔ میں دو مہینے کی چھٹی لے کر الٰہ آباد آ گیا ہوں۔ اس خط کا جواب شب خون کے پتے پر روانہ فرمائیں۔ پتا درج ذیل ہے۔

اُمید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

آپ کا
شمس الرحمٰن فاروقی

(۱۲)

Private Quarters
Behind F Block
River Bank Colony,
Lukhnow-1
۲۵ دسمبر ۱۹۷۰ء

برادرم مکرم! آپ کے دونوں خط (یکم نومبر کا ایروگرام اور بعد کا لفافہ) مل گئے تھے۔ میری کم بختی ہے کہ دورانِ سر اور عام اضمحلال کے باعث اب تک جواب نہ لکھ سکا۔ سب سے پہلے تو یہ عرض کرنا ہے کہ اس سے بڑھ کر خوشی کیا ہو سکتی ہے کہ آپ لکھنؤ تشریف لائیں اور غریب خانے پر قیام فرمائیں۔ کرام نما و فرود آ کہ خانہ خانہ تست کے علاوہ کیا عرض کر سکتا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر تم ان دنوں میں باہر نہ جانے والے ہو تو میں لکھنؤ آؤں۔ آپ کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ تم فروری میں لکھنؤ میں میرا انتظار کرو، میں کسی دن ایک دو گھنٹے کے لیے آ جاؤں گا۔ اس صورت میں بھی آپ مجھے منتظر اور چشم براہ پاتے۔ بلکہ مجھے اور بھی خوشی ہوگی اگر آپ ایک دن ہی کے لیے سہی، الٰہ آباد بھی تشریف لاتے۔ لکھنؤ میں حسب دل خواہ میں آپ کی مدارات نہ کر سکوں گا کیوں کہ گھر بہت چھوٹا ہے اور وہاں کے لوگوں کو جدید شاعری سے دل چسپی بس واجبی ہے۔ لکھنؤ میں ایک جلسہ اور الٰہ آباد کے نوجوان ادیبوں کی طرف سے ایک چھوٹا سا Reception الٰہ آباد میں۔ یہ میرا پروگرام ہے۔ مغنی حیدر آباد میں ایک Seminar رکھنا چاہتے ہیں، انشاء اللہ میں اس میں بھی شریک ہوں گا۔ بہرحال میری اور جمیلہ کی طرف سے آپکو پوری پوری دعوت ہے، آپ جب، جہاں اور جتنے دن تک چاہیں رہیں۔ الٰہ آباد اور لکھنؤ دونوں گھر آپ کے لیے حاضر ہیں۔ علی گڑھ، دہلی میں بھی آپ کو انشاء اللہ کوئی زحمت نہ ہوگی۔ دہلی میں بھی غالباً ایک جلسہ ہوگا۔ بمبئی کے لیے بھی وہاں کے بڑے لوگ ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے۔ جدید ادیبوں کی طرف سے بھی ایک جلسہ ہوگا۔ بہرحال، آپ اپنا Final پروگرام جلد از جلد لکھ بھیجیں الٰہ آباد کا خیال رکھتے ہوئے۔ میرے خیال میں U.N کی وجہ سے آپ کو Visa ملنے میں کوئی مشکل نہ ہوگی۔

شعر و حکمت کے لیے میں نے ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے، مغنی تبسم نے اسے بہت پسند کیا ہے۔ خدا کرے آپ کو بھی پسند آئے۔ ممکن ہے آپ میرے نکالے ہوئے نتائج سے اتفاق نہ کریں، لیکن مطالعے کے خلوص کو شاید آپ سراہیں۔ شاعری کے تفاعل کے بارے میں آپ اور مجھ میں خاصا اختلاف رائے ہے (جیسا کہ آپ کے تازہ مکتوب اور لا = انسان کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے) اسی وجہ سے میرا تنقیدی طریق کار بھی آپ کو شاید بہت پسند خاطر نہ ہو، بہرحال میں نے اپنی حد تک محنت اور غور و فکر اور ایمان داری سے آپ کے کلام کو پڑھا ہے۔ میرا Conclusion یہ ہے کہ آپ کے یہاں شعر الصوت کی ایک خوش گوار ترین شکل نظر آتی ہے اور آپ کی بہترین نظموں میں صوت یعنی آہنگ ہی معنی کا کام انجام دیتا ہے۔

میں نے ''شعر، غیر شعر اور نثر'' کے متعلق آپ کے ارشادات تازہ شب خون میں دے دیے ہیں، اُمید ہے آپ کو اعتراض نہ ہوگا۔

شب خون کے پرانے پرچوں کے بارے میں آپ کا خط آیا تھا جو پرچے مل سکے ان کو بحفاظت Pack کر کے سمندری ڈاک سے بھیج دیا ہے۔ ہوائی ڈاک سے خرچ بہت آتا ہے۔ خدا کرے بخیریت آپ تک پہنچ جائیں۔

لا = انسان کی کتابت شروع ہونے جا رہی ہے۔ چند غلطیاں جو مجھے نظر آئی ہیں، درج کر رہا ہوں۔ ان پر آپ کی رائے مطلوب ہے۔ میں ابھی الٰہ آباد ہی میں ہوں لیکن جنوری کی ۸ تک لکھنؤ پہنچ جاؤں گا۔ جواب لکھنؤ کے ہی پتے پر لکھیں۔ نئے سال کی مبارک باد۔

آپ کا
شمس الرحمٰن فاروقی

(۱۳)

Camp Bareilly

24-3-71

برادر مکرم! آپ کے دونوں نوازش نامے مل گئے تھے۔ میں حسبِ معمول چند پریشانیوں اور بیماریوں میں مبتلا تھا، اس لیے خاموش رہا۔ یہ معلوم کر کے دلی افسوس ہوا کہ آپ کا ارادۂ سفر منسوخ نہیں تو ملتوی ہو ہی گیا ہے۔ خدا کرے، نومبر کے بعد ہی سہی، آپ تشریف تو لائیں۔ یہاں آپ کی آمد کا بڑا چرچا تھا، تیاریاں تھیں، لوگ ہر طرف منتظر تھے، بڑی مایوسی ہوئی۔

میں ادھر مالی مشکلات میں بھی گرفتار تھا، اس وجہ سے رائلٹی والا کام نہ ہو سکا۔ اب حالات نسبتاً بہتر ہیں۔ جلد ہی دلی کے پتے پر ڈرافٹ بھیج دوں گا۔ پانچ سو کتابیں چھاپنے کا ارادہ ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ استطاعت اجازت نہیں دیتی۔ شب خون کے مالی اور انتظامی حالات کچھ اس قدر خراب ہیں اور خود میں پس ماندگی کی ایسی منزل میں ہوں کہ زیادہ کی ہمت نہیں پڑتی۔ بہر حال، دوسرا ایڈیشن، انشاء اللہ جب چھپا تو اس کی رائلٹی بھی حاضر کرنے کی کوئی سبیل نکال لوں گا۔

شعر و حکمت آپ نے دیکھ لیا ہوگا۔ بحیثیت مجموعی کیسا لگا، میرے مضمون سے آپ زیادہ ناراض تو نہیں ہوئے؟

نئے نام میں "الہ آباد" پہنچتے ہی بھجوا دوں گا۔ اگلے ہفتے جانے کا ارادہ ہے۔

لا = انسان کی کتابت مکمل ہو گئی ہے۔ پروف دیکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد فوراً پریس بھیج دوں گا۔ جدید فارسی شاعری کا دیباچہ شب خون میں شامل کر رہا ہوں۔ چند دنوں میں اس کی کتابت بھی شروع کرا دوں گا۔

ادھر آپ نے کچھ نظمیں تو ضرور کہی ہوں گی؟ شب خون پر نظرِ کرم کیجیے۔

میں (نے) رام لعل سے پوچھا تھا۔ یہ وہ رام لعل نہیں ہیں جن سے آپ لاہور میں واقف تھے۔ امید ہے شب خون اب آپ کو باقاعدگی سے مل رہا ہوگا۔

آپ کا
شمس الرحمٰن فاروقی

(۱۴)

لکھنؤ

۱۲ مئی ۱۹۷۱ء

برادر مکرم! نوازش نامہ کل ملا، ممنون ہوں۔ میں اب پہلے سے بہت بہتر ہوں، آپ کی محبت کا شکر گزار ہوں کہ دوائیں بھجوانے کی پیش کش کی۔ مغنی کو میں ۵۰ نسخوں کی قیمت ان کا خط آتے ہی بھجوا دوں گا لیکن ڈھائی ڈھائی سو کتابوں کے بھاری پارسل بیرون ملک بھجوانا ممکن نہ ہوگا۔ کیوں کہ اس کے لیے حکومت سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ پچاس روپے کی قیمت تک کی چیزیں تو بھجوائی جا سکتی ہیں لیکن اس سے زیادہ کے لیے Declaration دینا اور دوسری بہت سی کارروائیاں کرنی پڑتی ہیں جو ممکن العمل نہ ہوں گی۔ ایسی صورت میں مجھے جگہ جگہ وضاحت اور جواب دہی کرنی ہوگی جو میں بوجوہ نہ کر سکوں گا۔ استدعا ہے کہ آپ اپنے اس Plan پر نظرِ ثانی کریں۔

مجھے خوشی ہے کہ مضمون آپ نے پسند کیا۔ حوالوں کا میں خود بہت زیادہ قائل نہیں ہوں، لیکن چند وجہیں مجبور کرتی ہیں کہ ان پر تکیہ کیا جائے۔ (۱) جس قسم کے نظریات اور Judgements میں نے مضمون میں پیش کیے ہیں اگر ان کی پشت پناہی حوالوں سے نہ ہو تو عام قاری انھیں قبول نہ کرے۔ (۲) اگر حوالے نہ ہوں تو دوسرے لوگ دوسرے حوالوں کے ذریعہ میرے خیالات کے ابطال کا عمل شروع کر دیں۔ (۳) بسا اوقات حوالے مضمون کو Wider Perspective بخش دیتے ہیں اور Comparative Literature کا لطف آتا ہے۔ ہمارے یہاں ابھی Academician کی روایت باقی ہے۔

آپ کی نظموں کا شدت سے انتظار رہے گا۔

لا = انسان پریس بھیج دی ہے، انشاء اللہ بہت جلد چھپنا شروع ہو جائے گی۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

آپ نے نئے نام کی فرمائش کی تھی، عثمانی صاحب کے ہاتھ بھجوا دوں گا اور آپ کی نظموں کی Tape بھی۔

آپ کا
شمس الرحمٰن فاروقی

(۱۵)

لکھنؤ

۳۰ جولائی ۱۹۷۱ء

برادر مکرم، لفافہ مل گیا تھا۔ میرا عالم یہ ہے کہ ایک مشکل دور ہوتی ہے تو دوسری آ جاتی ہے۔ پچھلے دو مہینے سے والدہ کی سخت بیماری نے ہاتھ پاؤں پھلا رکھے تھے۔ اب جا کر ذرا طبیعت سنبھلی ہے۔ شرمندہ ہوں کہ ہر بار خط کے جواب میں دیر ہو جاتی ہے۔

کتابوں کے بارے میں آپ کی ہی تجویز پر عمل ہوگا، بیس بیس یا کم زیادہ کر کے آپ کو بھجواتا رہوں گا۔ مغنی صاحب کے روپے بھی ادا ہو جائیں گے۔ ان سے میں نے بات کر لی ہے۔ صرف مشکل یہ ہے کہ مسلسل بیماریوں اور دوسرے اخراجات نے اس قدر زیرِ بار کر دیا ہے کہ اس وقت کتاب کی اشا کھٹائی میں پڑ گئی ہے۔ مختصراً پلان یہ تھا کہ مکان کی تعمیر کے لیے جو قرض لیا تھا اس میں سے دو ہزار روپے نکال لوں گا لیکن اس کے بجائے چھ ہزار روپے اور قرض لینا پڑا۔ اس کے بعد میری کار ایک Accident میں تباہ ہو گئی۔ خیال تھا کہ انشورنس والے پوری رقم دے دیں گے۔ سرکاری قرض اور لے کر دو ہزار بچا لوں گا۔ وہ کتابوں میں لگ جائیں گے لیکن انھیں دنوں موٹروں کی قیمت ۲۲۰۰ روپے اور بڑھ گئی۔ وہ حساب برابر ہوا۔ بیوی، خود اور والدہ کی بیماریوں نے پس ماندہ چھوڑا ہی نہیں۔ غرض عجیب کیفیت ہے، بالکل حکومتوں کا سا حال ہو رہا ہے کہ assets بہت ہیں لیکن سب قرض میں بندھے ہوئے۔ ان حالات نے مجبور کر دیا ہے۔ پھر بھی، جیسے ہی کوئی صورت نکلی، کام شروع ہو جائے گا۔ میں آپ سے سخت شرمندہ ہوں لیکن پچھلے دو برسوں میں میرا مالی نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ شب خون تو خیر ہمیشہ سے مفلوک الحال تھا۔ آپ کو یقین نہ آئے گا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر مہینے تین سو روپے کا نقصان ہوتا ہے۔ معافی چاہتا ہوں، اپنا رونا لے بیٹھا۔ مالی حالات کی تفصیل کہنے اور سننے والے، دونوں کے لیے Embarassing ہوتی ہے۔

آپ لکھتے ہیں کہ اپنی ادبی عمر کے زیاں کا احساس آپ کو ستاتا ہے۔ حالاں کہ ہم لوگوں کا خیال یہ ہے کہ آپ سے زیادہ Fruitful شاید ہی کسی شاعر کی عمر ہمارے عہد میں رہی ہو۔ صرف میرا جی کو Comparrably Fruitful کہا جا سکتا ہے۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ آپ کے بعد آنے والے ادیبوں اور نقادوں کے دل میں آپ کے لیے کتنی توقیر ہے۔ آپ ہرگز یہ نہ سوچیں کہ لوگوں نے آپ کا اعتراف نہیں کیا۔ Generosity ہمارے پچھلے نقادوں کا شعار کبھی نہیں رہی۔ اسی وجہ سے انصاف بھی کم ہی ہوا، لیکن اب وہ بات نہیں ہے۔ اپنے کارناموں پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا مردوں کا شیوہ نہیں ہے لیکن اپنے کارناموں کو خود ہی Belittle کرنا نہ انکسار ہے نہ واقعیت۔

خدا کرے آپ ہر طرح اچھے ہوں۔ اپنی نظم جلد عنایت فرمائیے۔

آپ کا
شمس الرحمٰن فاروقی

(۱۶)

۲۸-۱۰-۷۱

برادر مکرم! آپ کی انتہائی خوبصورت نظمیں ملی تھیں۔

سراپا تشکر ہوں۔ آپ کی شاعری اب بھی نئے امکانات سے بھر پور ہے۔ یہ امر ہم لوگوں کے لیے باعث حیرت و مسرت ہے۔ ورنہ آپ کی طویل مشق سخن سے بہت کم عمر رکھنے والے شعرا آج کل محض اعادۂ فکر و اسلوب میں مصروف ہیں۔

آپ کی پانچ نظموں میں سے ایک ''صدا دوئی کی آبنا کے آرپار'' شعر و حکمت میں چھپ گئی ہے۔ بقیہ چار نظمیں دو دو کر کے اگلے اور اس سے اگلے شب خون میں آرہی ہیں۔

ان دنوں حالات ذرا ساز گار ہوتے نظر آتے ہیں۔

لا = انسان کتابت کی ہوئی رکھی ہے۔ کاغذ کا انتظام ہو رہا ہے، انشاء اللہ جلد پریس پہنچ جائے گی۔ ایک ہزار نسخے چھاپنے کا ارادہ ہے۔ -/۷ قیمت ہوگی۔ اس طرح ۷۰۰۰ کا ۱۵۰٪ ایک ہزار پچاس ہوتے ہیں۔ آپ کے پچھلے ارشاد کے بہ موجب ۱۵۰ نسخے (۱۰۵۰= ۷×۱۵۰) آپ کی خدمت میں باقساط روانہ کر دیے جائیں گے۔ ان کی ترسیل میں جو خرچ ہوگا وہ ادارہ برداشت کر لے گا۔ اُمید ہے کہ یہ تجویز آپ کو پسند خاطر ہوگی۔ اُردو کی مارکیٹ دیکھتے ہوئے مجھے ہر کتاب سے ۵۰٪ سے زیادہ Return نہ ملے گا۔ اس حساب سے فائدہ نقصان تقریباً برابر ہی ہو جائے گا۔ یہ ضرور ہے کہ کتاب نسبتاً جلد نکل جائے گی۔

شب خون کے جن شماروں کی آپ کو ضرورت ہو، آپ لکھ بھیجیں تا کہ دوبارہ بھجوا سکوں۔ ایک بار سمندری ڈاک سے ایک بنڈل بھجوایا تھا، خدا معلوم کہاں غائب ہو گیا۔ نئے نام تو پہنچ گئی ہوگی؟

آپ کا
شمس الرحمٰن فاروقی

(۱۷)

۱۱ نومبر ۷۱ء

برادر مکرم، کرم نامہ دونوں نظموں کے ساتھ ملا۔ اس نوازشِ خاص کے لیے ممنون ہوں۔ دونوں نظمیں حسب معمول بہت خوب ہیں لیکن زنجبیل کے آدمی تو بہت ہی عمدہ نظم ہے۔ بحر کامل سالم کے وزن کو آپ نے بہت سی نظموں میں استعمال کیا ہے اور ہر بار نئے لطف کے ساتھ۔ آہنگ کی یہ جلوہ گری آپ ہی کا حصہ ہے۔

فارسی شاعری والی کتاب فی الحال مالی مجبوریوں کی وجہ سے معرضِ التوا میں ہے۔ جوں ہی حالت سدھری، انشاء اللہ اس پر ہاتھ لگ جائے گا۔ تاخیر کے لیے شرمندہ ہوں۔

ان دو نظموں (میں) ایک ایک جگہ ذرا سا اشتباہ ہے۔ اسے دفع کرنے کی زحمت اُٹھائیں، ممنون ہوں گا۔

زنجبیل کے آدمی جہاں سے وزن فعولن ہو جاتا ہے، پہلا لفظ غالباً سرینوں ہے؟ نقطے نہیں لگے ہیں۔ آئندہ بھی یہ لفظ آیا ہے۔

نیا ناچ: اے خدا تو بھی ذرا اپنے گل (؟) ولا (؟) سے اٹے جوتے اُتار۔

گاف کے مرکز صاف نہیں ہیں۔ اور گل/کل ولا کی ترکیب سمجھ میں نہیں آئی۔

آپ کا
شمس الرحمٰن فاروقی

(۱۸)

Director Postal Services
Lucknow-1

۱۴/اگست ۷۲ء

برادر مکرم و معظم، ایک طویل عرصے کے بعد شرف مخاطبت حاصل کر رہا ہوں۔ فروری میں اچانک میرے باپ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر زیادہ تھی اور میرا خیال تھا کہ جب بھی کبھی (اگر چہ بظاہر کوئی اندیشہ نہ تھا) ان کا سانحہ ارتحال پیش آئے گا، میں اسے بہ آسانی برداشت کر لوں گا لیکن حقیقت اس کے برعکس نکلی۔ دل پر اب تک اثر ہے اور اس حد تک کہ لکھنے پڑھنے سے بالکل معذور ہو گیا ہوں۔ شب خون سے انھیں بہت دل چسپی تھی، اس کی شکل سے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ کئی مہینوں کی کش مکش کے بعد فیصلہ کیا کہ بند کر دوں گا لیکن پھر دوستوں کے اصرار نے مجبور کیا۔ اس چپقلش میں اس کی پابندیِ اشاعت مجروح ہو گئی۔ جون کا شمارہ جولائی میں کبھی نکلا تھا۔ جولائی کا شمارہ اب تک پریس نہ جا سکا۔ ورنہ عام حالات میں اب ستمبر کا شمارہ نکلنے والا ہوتا۔

اس ذہنی پراگندگی اور پھر ہنگامہ دار و گیر نے آپ کو خط لکھنے سے باز رکھا۔ شرمندہ ہوں۔ خدا کرے آپ بخیریت ہی ہوں۔

چودھری محمد نعیم (مدیر محفل) علی گڑھ سے اُکتا کر یا مایوس ہو کر امریکہ واپس جا رہے ہیں۔ انہوں نے بطور قرضِ حسنہ ایک ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اب لا = انسان کی اشاعت ممکن ہو گئی ہے۔ انشاء اللہ دسمبر ۷۲ء تک ضرور چھپ کر شائع ہو جائے گی۔ آپ کے لیے ۱۵۰ نسخے محفوظ کر لیے گئے ہیں، بیس پچیس کی تعداد میں آپ کی خدمت میں روانہ کیے جاتے رہیں گے۔

ان دنوں کچھ شعر ہوئے ہیں تو عنایت فرمائیے۔ شکریہ

آپ کا
شمس الرحمٰن فاروقی

(۱۹)

لکھنؤ
۲۸/اگست ۷۲ء

برادرِ مکرم! کچھ دن ہوئے ایک تفصیلی خط لکھا تھا، ملا ہوگا۔ عزیزی میاں شبیہ الحسن رضوی عرف شبن اعلیٰ تعلیم کی غرض سے قم جا رہے ہیں۔ یہ اور ان کے ایک دوست محمد علی آپ سے ملنے کے بے حد مشتاق ہیں۔ اُمید ہے آپ اُنھیں کچھ وقت دے سکیں گے۔

نئے نام کا ایک نسخہ جو شاید پچھلی بار ڈاک سے آپ کو نہیں مل سکا تھا اور اپنے ایک مضمون کا تراشہ بھجوا رہا ہوں۔

اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا
شمس الرحمٰن فاروقی

(۲۰)

30.8.72

برادرِ مکرم! کرم نامہ آج ملا۔ ممنون ہوں۔ یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ آپ کو شب خون بھی عرصے سے نہیں ملا ہے۔ پچھلے دنوں شب خون کی اشاعت میں وہ پابندئ وقت نہیں رہ گئی جو پہلے تھی، لیکن پرچہ تو نکل ہی رہا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ دفتر والے حسب معمول آپ کو بھیج رہے ہوں گے۔ دو تین دن ہوئے یہاں کے دو لڑکے اعلیٰ تعلیم کے لیے قم گئے ہیں۔ میں نے ان کے ہاتھ آپ کو نئے نام کی ایک جلد بھیجی ہے۔ اگر خبر ہوتی تو شب خون کے چند شمارے بھی بھیج دیتا۔ بہر حال انھیں فوراً سمندری ڈاک سے بھجوا رہا ہوں۔

لا = انسان انشاء اللہ ۳۰ نومبر کے پہلے پہلے چھپ جائے گی اور اگر سب نہیں تو چند بنڈل آپ کی خدمت میں پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد بھی اسی پتے پر بھجواتا رہوں گا۔ اُمید ہے آپ اپنے نئے پتے سے مطلع کر دیں گے تا کہ براہِ راست ممکن ہوا تو براہِ راست، ورنہ کسی اور ملک کے راستے سے آپ سے خط و کتابت ہو سکے۔

نظموں کا انتظار رہے گا۔ میری بیوی جمیلہ سلام لکھواتی ہیں۔

آپ کا
شمس الرحمٰن فاروقی

ادبی خبریں

تعزیتی ریفرنس

ڈاکٹر عباس نجمی، اظہر جاوید، رفیق اظہر اور افضال شاہد کی وفات پر لاہور اور مختلف شہروں میں تعزیتی ریفرنس منعقد ہوئے جس میں مرحومین کی زندگی کو زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا اور ان کی بخشش کے لیے دُعائیں بھی مانگی گئیں۔

سارک ادبی میلہ لکھنؤ

فاؤنڈیشن آف سارک رائٹرز اینڈ لٹریچر کے زیر اہتمام 16,17,18 اور 19 مارچ کو لکھنو میں سارک ادبی میلے کا انعقاد کیا گیا ہے جس میں سارک ممالک سے وفود کے علاوہ بھارت کے تمام صوبوں سے بھی رائٹرز اور فن کار شرکت کریں گے۔ پاکستان سے اداکارہ نشو، اقبال باہو، حضرت شام، سلیم پاشا، عائشہ ذی خان اور حسن عباسی کے علاوہ بہت سے ادیب شرکت کریں گے۔ پاکستانی وفد کی قیادت چوہدری نثار کریں گے۔

عامر بن علی کے اعزاز میں تقریب

جاپان میں مقیم معروف شاعر اور ماہنامہ ارژنگ کے مدیر اعلیٰ عامر بن علی گزشتہ ماہ جاپان سے پاکستان آئے تو ڈاکٹر صغریٰ صدف نے اُن کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا جس میں لاہور کی معروف ادبی، سماجی اور شوبز کی شخصیات نے شرکت کی۔

اسلام آباد بار ایسوسی ایشن کا مشاعرہ

بہار کی آمد آمد ہے۔ وطن عزیز میں ہر طرف رنگا رنگ پھول کھل رہے ہیں۔ ابھی چند برس پہلے بہار کی آمد پر آرٹ، میوزک، ادب اور ثقافت کے پروگرام اور سرگرمیاں عروج پر ہوا کرتی تھیں۔ پھر دہشت گردی کی لہر نے انہیں ماند کر دیا تھا۔ اب حالات کچھ بہتر ہوئے ہیں تو رونقیں رفتہ رفتہ واپس لوٹ رہی ہیں۔ بہار کی آمد پر اسلام آباد بار ایسوسی ایشن نے ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ یہ تقریب بار ایسوسی ایشن کے گیلانی ہال میں منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت ملک کے نامور شاعر افتخار عارف نے کی۔ مہمانِ خصوصی مجتبیٰ حیدر شیرازی، مہمانِ اعزاز ظہیر باقر بلوچ تھے۔

اس تقریب میں معروف شاعر اور ماہنامہ ''ارژنگ'' کے مدیر حسن عباسی نے لاہور سے بطور خاص شرکت کی۔ جبکہ نظامت کے فرائض جدید لب و لہجے کے خوبصورت شاعر علی یاسر نے ادا کیے۔ دیگر شعرائے کرام میں پروفیسر احسان اکبر، سرفراز شاہد، حلیم قریشی، اختر عثمان، رفیق سندیلوی، جنید آذر، شہباز چوہان، انجم خلیق، اصغر عابد، منظر نقوی، اختر رضا سلیمی، شکیل جاذب، عمران رضا، نورین طلعت عروبہ، عابدہ تقی، شمشیر حیدر اور حکیم صفدر وامق، ایوب ارباب جنرل سیکرٹری بار، اور جاوید اکبر شاہ پریذیڈنٹ بار ایسوسی ایشن شامل ہیں۔ ہال میں وکلاء کی کثیر تعداد موجود تھی اور انہوں نے ہر اچھے شعر پر دل کھول کر داد دی۔ مشاعرہ کے اختتام پر صدر بار ایسوسی ایشن کے صدر اکبر شاہ نے مہمان شعراء کا شکریہ ادا کیا۔ مشاعرہ کے بعد پرتکلف ڈنر کا اہتمام بھی تھا۔

ڈاکٹر شہناز مزمل کے اعزاز میں تقریب

ڈاکٹر شہناز مزمل کے اعزاز میں تقریب ہال نمبر 3 الحمرا آرٹ کونسل میں منعقد ہوئی۔ جس میں شاعروں ادیبوں اور فیملیز نے بھرپور شرکت کی۔ تقریب میں معروف گلوکار عدیل برکی نے ڈاکٹر شہناز مزمل کے کلام گا کر حاضرین سے بھرپور داد حاصل کی۔ اس خوبصورت تقریب کے مہمان خصوصی لاہور آرٹ کونسل کے چیئرمین عطاء الحق قاسمی تھے۔

پاکستان برائٹ یوتھ کونسل کے زیر اہتمام محفل موسیقی

برائٹ یوتھ کونسل کے قیام کا مقصد پاکستانی معاشرے سے نشے کی لعنت کو ختم کرنا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر وہ صحت مندانہ سرگرمیوں کے فروغ کے لیے کوشاں رہے۔ اس تنظیم کے چیئرمین غلام احمد مختلف تقریبات کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ گزشتہ دنوں باغ جناح چوپال میں محفل موسیقی کا پروگرام ہوا جس میں نوجوان اور سینئر گلوکاروں نے شرکت کی جن میں شریف خان، اسلم، افشاں سیمی، پونم، مسرت شاہ، خواجہ گلریز نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ معروف شاعر حسن عباسی کی غزلیں شریف خان اور اسلم نے گا کر محفل کا رنگ دوبالا کر دیا۔ انتخاب احمد نے تقریب کے حوالے سے اظہارِ خیال کیا۔ اس خوبصورت تقریب کی نظامت چیئرمین پاکستان برائٹ یوتھ کونسل غلام احمد نے کی۔

کل پاکستان محفل مشاعرہ

خواتین کے عالمی دن کے موقع پر منسٹری آف انفارمیشن اینڈ کلچر پنجاب کے زیر اہتمام الحمرا آرٹ کونسل کے ہال 3 میں کل پاکستان محفل مشاعرہ کا انعقاد ہوا جس کی نظامت معروف شاعرہ ڈاکٹر صغرا صدف نے کی۔ دیگر شاعرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

زہرہ نگاہ، فہمیدہ ریاض، شاہدہ حسن، ڈاکٹر فاطمہ حسن (کراچی)، کشور ناہید، شبنم شکیل (اسلام آباد)، ڈاکٹر عظمیٰ سلیم (سکردو)، طاہرہ احساس (خضدار)، ڈاکٹر غزالہ فرخ (مظفر آباد)، حسینہ گل (پشاور)، نسرین انجم بھٹی، یاسمین حمید، فرخ زہرہ گیلانی، ڈاکٹر شہناز مزمل، بشریٰ اعجاز، صوفیہ بیدار، رخشندہ نوید اور رابعہ رحمٰن (لاہور) کے علاوہ حاضرین کی کثیر تعداد موجود تھی جنہوں نے خواتین شاعرات کو ان کے بہترین کلام پر بھرپور داد دی۔

ادبی خبریں

صدا بانٹتی تو ہے

صادق آباد میں مقیم معروف شاعر اظہر ادیب کا غزلیات پر مشتمل تیسرا مجموعہ کلام ''صدا بانٹتی تو ہے''، نستعلیق پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوگیا ہے۔

بھیگی رات کی دُھن

معروف شاعر اظہر ادیب کا ہائیکو پر مشتمل پہلا مجموعہ کلام ''بھیگی رات کی دُھن''، نستعلیق پبلی کیشنز لاہور سے مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہوگیا ہے۔

نیا زمانہ نئی کہانیاں

گوجرانوالہ میں مقیم نوجوان کہانی کار عنصر علی بریار کا کہانیوں پر مشتمل پہلی کتاب ''نیا زمانہ نئی کہانیاں''، مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہوگئی ہے۔

کوثر رحمت

خیر پور ٹامے والی کے معروف نعت گو شاعر عبدالسلام ثمر کا پہلا نعتیہ مجموعہ ''کوثر رحمت'' کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔ جس میں ڈاکٹر ریاض مجید، عطاء الحق قاسمی، صبیح رحمانی اور رشید عثمانی کی عبدالسلام ثمر کی نعت گوئی کے حوالے سے آراء شامل ہیں۔

سفر لامکاں تک ہے

سیالکوٹ میں مقیم معروف شاعر پروفیسر عبدالشکور بھلی کا پہلا مجموعہ کلام ''سفر لامکاں تک ہے'' شائع ہوگیا ہے۔ جس میں ان کی انگریزی اُردو اور پنجابی شاعری شامل ہے۔ مجموعے کے حوالے سے سیّد امتیاز احمد نے اپنے تاثرات لکھے ہیں۔

''زرنگار'' کا تازہ شمارہ

معروف شاعر اور دانشور ضیاء حسین ضیا کی زیر ادارت ''زرنگار'' کا تازہ شمارہ فیصل آباد سے شائع ہوگیا ہے۔ ۷۰۰ صفحات پر مشتمل اس شمارے میں ملک کے نامور شعراء، افسانہ نگار اور ناقدین کی تخلیقات شامل ہیں۔

محبت کے دو رنگ

معروف شاعر اور ماہنامہ ''ارژنگ'' کے مدیر اعلیٰ عامر بن علی کی نئی کتاب ''محبت کے دو رنگ'' شائع ہوگئی ہے۔ جس میں گبریلا مسترال اور پابلو نرودا کی شاعری کے تراجم اور تعارف شامل ہیں۔ اس کتاب کا اہتمام نستعلیق پبلی کیشنز لاہور نے کیا ہے۔

''محبت چھوگئی دل کو'' کا دوسرا ایڈیشن

معروف شاعر عامر بن علی کے شعری مجموعے ''محبت چھوگئی دل کو'' کا دُوسرا ایڈیشن شائع ہوگیا ہے۔ ۳ ماہ قبل ان کے اس مجموعے کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ اس سے کتاب کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

معروف شاعر اور سفر نامہ نگار حسن عباسی کا دوسرا سفرنامہ ''ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا'' شائع ہوگیا ہے۔ یہ سفرنامہ ان کے UAE اور دوحہ کی سیاحت پر مشتمل ہے۔ اس سے قبل ان کا سفرنامہ بھارت ''محبت کے پروں میں گھنٹیاں باندھو'' ادبی اور عوامی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکا ہے اور نہایت قلیل عرصہ میں اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

اُداس کر گئے ہو

معروف شاعرہ راحیلہ رُباب کا پہلا شعری مجموعہ ''اُداس کر گئے ہو'' کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔ اس شعری مجموعہ میں ان کی غزلیات اور نظمیں شامل ہیں۔ اس مجموعہ پر ملک کے معروف کالم نگاروں نے کالم بھی لکھے ہیں۔

دریچوں سے صبائیں دے رہا ہے
مجھے موسم دُعائیں دے رہا ہے
تسلی، آشتی، چاہت کی خاطر
خدا بندوں کو مائیں دے رہا ہے
خدا کی آزمایش ہے حسینی
جنوں کو کربلائیں دے رہا ہے
میں اس کے سامنے ہارا نہیں وہ
سزاؤں پر سزائیں دے رہا ہے
مسافت پر میں اس کی چل پڑا ہوں
وہ مجھ کو کہکشائیں دے رہا ہے
نکل آؤں گا اک دن دائرے سے
وہ چکر دائیں بائیں دے رہا ہے
کوئی مضموں ہے جو حسن و ادا کی
قلم کو داشتائیں دے رہا ہے
وہی پردہ رکھے گا تیرا ثاقب
سروں پر جو ردائیں دے رہا ہے
(آصف ثاقب)

معروف کالم نگار، ڈرامہ رائٹر، مزاح نگار اور شاعر عطاء الحق قاسمی کی سالگرہ کے موقع پر احباب کی طرف سے آراستہ کی جانے والی محفل کے چند مناظر

یہ نظم سالگرہ کی تقریب میں پڑھی گئی

زندگی کے شہر کا پھر در کھلا، میرے عطا
آج کی یہ شام ہے شام عطا، میرے عطا
اک پرندہ اڑ گیا پھر آج تیری شاخ سے
پیڑ ہے تو لمحہ موجود کا، میرے عطا
آ رہے ہیں یار ہو کے پھر ہمارے شہر میں
پھر کوئی تدبیر کر، پتھر اٹھا، میرے عطا
تیرا ہر نقش قدم روشن دلیل صبح نو
فکر تیری روشنی کا آئنہ، میرے عطا
دوستوں میں ہے بہت مشہور تیری دوستی
تیرا انداز محبت ہے جدا، میرے عطا
میں مبارکباد تجھ کو دینے آیا تھا مگر
اک برس میں دور تجھ سے ہو گیا، میرے عطا
آج روشن ہے یہ محفل و عطاؤں کے سبب
ایک میں اور دوسرا تو ہے عطا، میرے عطا
(کیپٹن عطا)

سالگرہ کے موقع پر معروف شاعر ظفر اقبال نے یہ قطعہ پڑھ کر محفل کو چار چاند لگا دیے

مزاح و طنز نگاری جو تجھ پہ ناز کرے
شعور شاعری جو خم سر نیاز کرے
یہی ہے آج ترے سارے دوستوں کی دعا
کہ اور بھی تری رتی خدا دراز کرے

الفرید فاؤنڈیشن اور ماہنامہ "ارژنگ" کے زیر اہتمام میاں چنوں کی سرزمین پر

پاکستان مزاح الیون مشاعرہ

قندیل مشاعرے کی نظامت کر رہی ہیں جبکہ انور مسعود، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، خالد مسعود خاں، اسد جعفری
خورشید مستانہ، سلیم اختر (برطانیہ)، فہیم ضیاء اور عامر بن علی اپنا کلام پیش کرتے ہوئے

سامعین میں رانا بابر حسین، چوہدری شاہد بشیر، حاجی رحمت مغل، میاں آصف ندیم، حاجی عابد حسین
رانا اشفاق، حاجی اشرف، شیخ طارق عزیز، چوہدری وسیم، ملک محمد آصف ودیگر نمایاں ہیں

Read Arxang Online.
www.millat.com
www.amirbinali.com